اُردو نامہ

ترقیٔ اُردو بورڈ کا باتصویر مجلّہ

سولھواں شمارہ

مع

اردو لغت

قسط نمبر ۱۰

ترقی اردو بورڈ کا سہ ماہی مجلہ

نگران

جناب ممتاز حسن

ادارۂ تحریر

جوش ملیح آبادی — شان الحق حقی

خواجہ حمید الدین شاہد

ترقی اردو بورڈ، کراچی

ٹیلیفون نمبر : ۲۲۱۶۳

چندہ سالانہ — فی پرچہ
چار روپے * ایک روپیہ

اردو منزل، جمشید روڈ کراچی ۵
(مغربی پاکستان)

مطبوعہ ٹیکنیکل پرنٹرز، کراچی

اردو نامہ

شمارہ ۱۶ - اپریل تا جون ۱۹۶۴ء

مضامین

۱ - افتتاحیہ	ادارہ	۲
۲ - اردو کی آوازیں	ڈاکٹر گیان چند	۷
۳ - لفظ صوفی کی تحقیق	سید قدرت نقوی	۱۶
۴ - احسن اللہ خاں بیان	سخاوت مرزا	۲۷
۵ - مکتوب غالب	تحسین سروری	۳۸

نادرات

۶ - گلبن اردو	مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم	۴۱
۷ - کلام آزردہ	مرتبہ خلیق انجم	۵۳

شعبۂ لغت

۸ - اشتقاقیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۶۲
۹ - آریائی یا دراوڑی ؟	عین الحق فرید کوٹی	۶۵
۱۰ - اردو لغت مجمل ایڈیشن، قسط نمبر ۱۰	ادارہ	۱۷۱ تا ۱۹۴

متفرقات

۱۱ - آئینۂ ادب	آغا افتخار حسین	۶۹
۱۲ - مراسلات		۸۱
۱۳ - تبصرے		۹۳

سرورق : مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم
(ملاحظہ ہو مضمون صفحہ ۴۱)

سید یوسف بخاری مینجر ''اردو نامہ'' نے ترقی اردو بورڈ کراچی کی جانب سے شائع کیا۔

حقی صاحب ڈا
زریں کوب کو
لغت کی اسناد
کے کارڈ ملاحظہ
کرا رہے ہیں ۔
دائیں طرف سے
بیگم رضیہ فصیح اح
(جنہوں نے اپنی
کتاب 'سیر پاکستا
پر بورڈ اور گلڈ
کا مشترک انعا
حاصل کیا) ۔
بیگم نور الصباح
حقی صاحب ،
ڈاکٹر زریں کوب
مادام زریں کوب

طہران یونیورسٹی
کے نامور اساتذہ
ڈاکٹر فروزانفر
اور پروفیسر
زریں کوب
ترقیٔ اردو بورڈ
میں چند ساعت
مہمان رہے ۔
دائیں طرف سے :
ڈاکٹر فروز انفر ،
ڈاکٹر مہیار نوابی
کلچرل کونسلر
سفارت خانۂ ایران،
بیگم انور عنایت اللہ،
بیگم رضیہ فصیح احمد،
بانوئے زریں کوب

اردو نامہ

۱۲ مئی کو صدر مملکت پاکستان نے کراچی میں اردو کالج کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا - اردو کالج ۱۹۴۹ع سے انجمن ترقیٔ اردو کے زیر اہتمام ڈگری کے مدارج تک آرٹ ، سائنس ، قانون اور تجارت کے شعبوں کی تعلیم اردو میں دے رہا ہے - ۵۵ع تک ایم اے کی جماعتیں بھی قائم تھیں جو اب یونیورسٹی میں چلی گئیں - طلبہ کی تعداد ابتدائی سال میں ۲۷۹ تھی- اب ۱۷۲۱ طلبہ ہیں اور ۶۰ استاد - نتائج سال بہ سال کسی دوسرے کالج سے کمتر نہیں ، بلکہ مجموعی طور پر بہتر اور قابل فخر رہے ہیں - پچھلے سال بی اے (آنرز)، بی ایس سی ، بی ایس سی (آنرز) اورایل ایل بی فائنل کے نتیجے سوفیصد رہے - بی اے کا نتیجہ ۸۲ء۷ فیصد اور ایل ایل بی سال اول کا ۸۳ء۶ فیصد - ان میں سے ۲۵ طلبہ نے اول درجہ اور یونیورسٹی میں امتیازات پائے - کھیلوں میں بھی بہت سی کامیابیاں حاصل ہوئیں-کالج کے مختلف شعبوں سے متعدد جرائد نکلتے ہیں یعنی : ''برگ گل'' ''اتحاد'' ''سائنس'' ''الجغرافیہ'' ''معاشیات'' ''آفتاب تازہ'' ''تجارت'' ''معارف اسلامیہ'' ''تعمیر نو'' ''تاریخ و سیاسیات'' ''فلسفہ و نفسیات''- یہ بھی ایک بین امتیاز ہے -

انگریزی لازمی زبان ہے ، لہذا طلبہ کے لئے ہر مضمون پر انگریزی کے ذخیرۂ علمی سے استفادہ کرنے کا دروازہ کھلا ہوا ہے ، نصابی کتابوں کی کمی کو بڑی حد تک اساتذہ نے اپنے مقالات یا اپنی کتابوں سے پورا کیا ہے- اب تک ۶۷ درسی کتابیں تیار کر چکے ہیں- یہی تدبیر انڈونیشیا میں اختیار کی گئی تھی- وہاں بھی اول اول بہت سے مضامین پر اساتذہ کے لکھوائے ہوئے نوٹ نصابی کتابوں کی صورت میں مرتب کر دیے گئے - اب جب کہ کراچی یونیورسٹی نے اردو کو اعلیٰ مدارج تک ذریعۂ تعلیم بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے - امید کی جا سکتی ہے کہ نصابی کتابوں کی کمی بڑی حد تک ہمارے فاضل اساتذہ کی تالیفات سے پوری ہو سکے گی - یہ صورت تراجم کے منصوبے سے بہتر ہے - بہت سی امہات الکتب کو بیشک ترجمے کے ذریعے بھی منتقل کرنا ہوگا - لیکن درسی اور نصابی کتابیں ہمارے اہل علم کو اب خود ہی تالیف کرنی چاہئیں-

اردو کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کا پہلا تجربہ مرحوم دلی کالج میں ۱۸۲۵ء ع میں شروع کیا گیا تھا - اس کے نتائج سے علمی و ادبی دنیا خوب واقف ہے - دوسری آزمائش عثمانیہ یونیورسٹی میں ہوئی - اس کے بعد کراچی کا اردو کالج ہمارا سب سے بڑا تعلیمی تجربہ ہے- یہی ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی سب سے مستحکم یادگار ہے - افسوس ہے کہ انجمن کی طرح یہ کالج بھی چند سال باہمی اختلافات کا شکار رہا - لیکن اس بات کا اعتراف واجب ہے کہ درس و تدریس کے عمل پر اس کا چنداں اثر نہ پڑا- انجمن کے آسمان بالا پرجو

کشمکش رهی اس سے کالج کی بنیاد میں تزلزل نہ آیا۔اساتذہ نے ابلاغ علم میں خیانت نہ کی۔

یہاں تعلیم مخلوط ہے - خواتین کے لئے علیحدہ اردو کالج بنانے کی تجویز بار ور نہ ہو سکی، لیکن اس کالج نے خود ہی اس کمی کو یوں پورا کر دیا کہ وہ منصوبہ غیر ضروری معلوم ہونے لگا - اس کے طلبہ میں بہت سے ملازم پیشہ نوجوان بھی ہیں - بہت سے ایسے لڑکے اور لڑکیاں بھی یہاں داخلہ حاصل کرتے رہے ہیں جنہیں دوسرے کالجوں میں جگہ نہ مل سکی - اس کے باوجود کالج کے نتائج اکثر کالجوں سے بہتر رہے - یہ اردو کی تعلیم کا ایک روشن کارنامہ ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب! ہم اس دن کے منتظر ہیں جب پاکستان کا ہر کالج اردو کالج بن جائے گا - لیکن اس کالج نے جو تقدم حاصل کرلیا ہے وہ ہمیشہ اس کے لئے باعث امتیاز و افتخار رہے گا۔ اب اس کا انتظام چند لائق، سرگرم اور پرخلوص لوگوں کے ہاتھوں میں ہے - نئی تعمیرات کا آغاز انجمن ترقیٔ اردو کے موجودہ صدر جناب اختر حسین (سی ایس پی) ، سکرٹری جناب جمیل الدین عالی، پرنسپل جناب کرنل عطاءالرحیم اور انتظامیہ کے دوسرے ارکان کی پرخلوص مساعی کا پہلا ثمرہ ہے- یہ حضرات اہل ملک کے دلی شکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں -

جناب صدر مملکت نے اس تقریب تاسیس پر چند بڑی غور طلب باتیں ارشاد فرمائیں- ملکی مسائل کے سلسلے میں صدر مملکت کو از روئے منصب ایک ایسا مقام حاصل ہے جہاں سے ان مسائل کا زیادہ مکمل اور مربوط جائزہ لیا جاسکتا ہے - بہت سی اونچ نیچ خود بخود ہموار ہوجاتی ہے، اور آنکھوں کے سامنے سے بعض ایسی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں جو شاید کسی اور زاویہ نظر سے پہاڑ معلوم ہوں - لہذا جناب صدر مملکت کی اس تجویز پر بہت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان کی سب زبانوں کو ایک ہی رسم خط یعنی خط نسخ اختیار کرلینا چاہیے۔

بورڈ کے مشیر طبی ڈاکٹر مظفر عباس (بائیں طرف)، معتمد اعزازی شان الحق حقی صاحب کے ساتھ

یہ ظاہر ہے کہ ہمارا پہلا مقصد قومی اتحاد و یگانگت اور پہلا نصب العین ملکی مفاد

ہے۔ ایک نئی مملکت کی حیثیت سے ہمیں اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ قومیں عام طور پر جن چیزوں سے پہچانی جاتی ہیں ان میں زبان کو نمایاں درجہ حاصل ہے۔ لیکن تاریخ تمدن رنگا رنگ بھی رہی ہے ارتقا پذیر بھی۔ اگر تاریخ صرف اپنے آپ کو دھراتی رہے تو زندگی ایک ہی دائرے میں گھومتی رہے۔ زندگی کا قدم ہمیشہ آگے کی طرف رہا ہے اور ہمیشہ نئے کرشمے سامنے آتے رہیں گے۔ چنانچہ ہم آج ایک ایسی قومیت میں منسلک ہیں جس نے جغرافیائی وحدت کو باطل کردیا ہے اور یہ بات انسان کی سرشت کے زیادہ مطابق ہے۔ انسان اپنے گھر، محلے اور شہر کی حدود سے گزر کر نئے رابطے قائم کرتا رہا ہے جو خونی رشتوں پر بھی غالب رہے ہیں۔ انسان مخلوق ناطق ہونے کی بدولت صرف خشک و تر سے علاقہ نہیں رکھتا، اصول، عقائد اور نصب العین سے بھی وابستگی رکھتا ہے۔ اپنے رشتے صرف جبلی طور پر نہیں، شعوری طور پر بھی قائم کرتا ہے۔ ہم ایسی دنیا میں رہتے ہیں جو قوموں میں بٹی ہوئی ہے، اور ہم بھی اپنی قومیت کے محافظ ہیں، لیکن اس آئیڈیالوجی سے منحرف نہیں جو در اصل ہماری قومیت کا طرہ٘ امتیاز ہے، اور جس میں اصول زندگی کو جغرافیے پر ترجیح حاصل ہے۔

اس وقت ہماری قوم دو متفرق جغرافیائی حدود میں ہے۔ یہ دونوں خطے کل تک ایک ہی جغرافیائی حد میں تھے، اس لحاظ سے یہ کوئی بڑی تبدیلی تو نہیں لیکن اتنا ہے کہ اب یہ ایک آئیڈیالوجی سے بھی وابستہ ہیں اور وحدت قومی کا شعور رکھتے ہیں۔ اس مخصوص صورت حال کی بنا پر ہمیں دو زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دینا پڑا۔ اتفاقاً یہ بھی اس رنگارنگ دنیا میں اپنی قسم کی واحد مثال نہیں ہے۔ پھر ان دونوں زبانوں میں کچھ قدریں مشترک بھی ہیں۔ یہ لسانیات سے تعلق رکھنے والوں کے لیے خاص دلچسپی کی بات ہے۔ یعنی اردو اور بنگالی نہ صرف ایک اصل کی دو شاخیں ہیں، بلکہ ان کا بہت سا سرمایہ، الفاظ بھی مشترک یا مماثل ہے۔ جدید لغت کے اضافے سے یہ اشتراک غالباً بڑھتا ہی رہے گا۔ اس کے علاوہ ترکیب نحوی کم و بیش یکساں ہے جو بہت بڑی سماثلت ہے۔ اس معاملے میں دونوں زبانوں کو انگریزی یا دوسری بیرونی زبانوں سے جو بعد ہے وہ ظاہر ہے اس صورت میں اگر دونوں قومی زبانوں کا رسم الخط بھی ایک ہو تو باھمی میل جول کا ایک اور دروازہ کھل جاتا ہے۔ پاکستان کی سب زبانیں آپس میں قریب آجاتی ہیں۔ صدر مملکت نے اسی بات پر توجہ دلائی ہے۔

بنگالی بھی مسلمانوں کی آمد سے پہلے ایک انگھڑ بولی تھی۔ اس کی تراش خراش اور اس کے ادب کی نشو و نما بنگال کے پہلے مسلمان حاکموں کے عہد میں اور مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بنگالی ہمیشہ عربی میں حروف لکھی جاتی تھی لیکن ظاہر ہے کہ یہ دربار میں فارسی کے ساتھ ہی ساتھ رائج تھی، اور غالباً دونوں کے لئے

اکثر ایک ہی رسم الخط استعمال ہوتا ہوگا۔ بنگال کے اسلامی عہد کے تاریخی کتبے سب کے سب فارسی میں ہیں۔ علاول عہد مغلیہ کا شاعر ہے۔ اس کی مشہور تصنیف ”پدماوتی“ کا سب سے پہلا نسخہ فارسی رسم الخط میں ہے۔ البتہ عہد انگریزی میں جب مسلمان اپنے اثرو اقتدار سے محروم ہو گئے اور ایک نیا ہندو سماج ابھرا، تو فارسی رسم الخط متروک ہو گیا۔

لیکن پچھلی صدی کے وسط میں بنگالی مسلمانوں نے اس کے احیا کے لئے نئے سرے سے تحریک شروع کی تھی۔ اس کے ساتھ فارسی و عربی الفاظ کو اپنانے کا رجحان بھی پیدا ہوا، جس کا سب سے اچھا اظہار

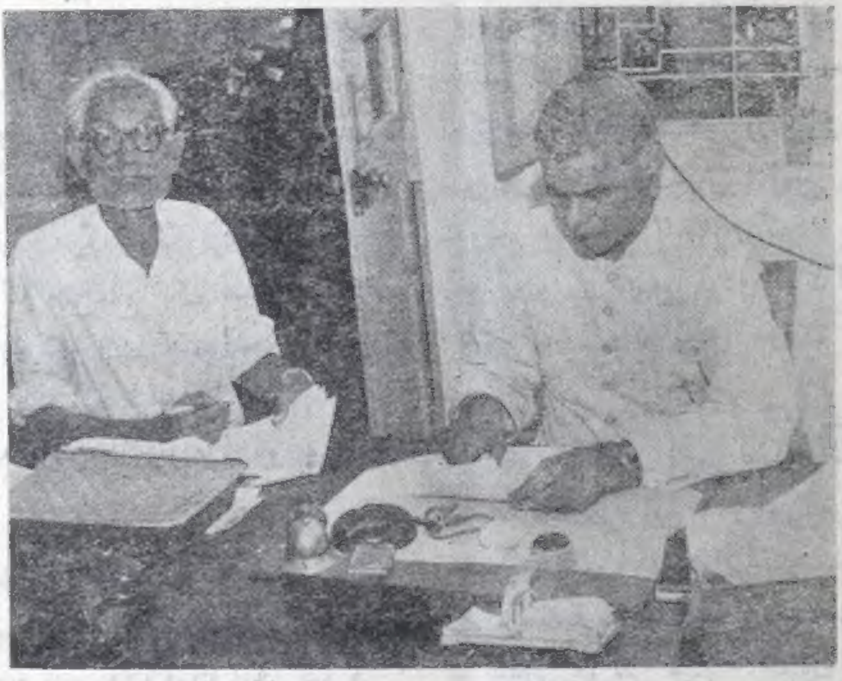

بورڈ کے افسر انتظامی مصور حسین صدیقی اور مددگار شعبہ مطبوعات سید یوسف بخاری

نذرالاسلام کی انقلابی شاعری میں ہوا۔ بقول پروفیسر انعام الحق: ”بنگالی میں خالص سنسکرت الفاظ پچیس تیس سے زیادہ نہیں۔ باقی یا تو پراکرت ہیں یا اَپ بھرنش“۔ (مسلم بنگالی ادب) ۔ لیکن علمی و ادبی زبان پر انگریزی عہد سے برابر سنسکرت کا غلبہ بڑھتا رہا ہے

یہ بنگالی ہندوؤں کے ثقافتی میلان کا نتیجہ تھا، لیکن بنگالی مسلمانوں کے ثقافتی تقاضے الگ ہیں اور اپنی جگہ اتنے شدید کہ ان کی خاطر ایک ملک کو تقسیم کرنا پڑا۔ اس وقت علاقائیت کا دبا دبا رجحان، نئی مملکت کی تشکیل اور نئی نئی آزادی کا ایک نفسیاتی ردعمل ہے جو دیرپا نہیں ہوسکتا۔ تاریخ احساس قومی کو مضبوط کرتی رہے گی۔ اس کی جگہ اس سے کوئی زیادہ بڑا اخلاقی اتحاد ہی لے سکتا ہے۔ ورنہ تفریق صرف تخریب کا حکم رکھتی ہے۔

عربی رسم خط بعض اعتبار سے ناقص لیکن بعض اعتبار سے مثالی بھی ہے۔ دنیا کا کوئی رسم خط ایسا نہیں جو ناقص نہ ہو۔ حروف ذہن کے لئے صرف اشارات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر آنکھیں حروف کی جگہ الفاظ کو پہچاننے کی عادی ہو جاتی ہیں، اور بہ یک نظر پورے جملے کو پڑھ لیتی ہیں۔ سنسکرت رسم الخط اپنی ترکیب کے لحاظ سے بڑا واضح، سکھانے

میں آسان لیکن برتنے میں مشکل ہے ۔ رومن عربی اور سنسکرت تینوں کے حروف ایک ہی اصل سے ہیں' لیکن عربی خط اس کی بڑی ترقی یافتہ صورت ہے۔ الگ الگ حرف، ٹائپ رائٹر اور ٹائپ کی طباعت کے لئے موزوں ثابت ہوئے لیکن در اصل یہ الفاظ کو تحریر میں لانے کا ایک نسبتاً قدیم یا ابتدائی طریقہ تھا۔ تعلیمی نفسیات میں دخل دینے والے بعض اوقات اردو لکھائی کو ناحق مشکل بتاتے ہیں ۔ یہ کوئی ایسا بڑا اشکال نہیں ۔ بچہ قواعد اور محاورے کی بڑی بڑی پیچیدگیوں اور نزاکتوں پر بہ آسانی عبور پا لیتا ہے۔ حروف تو پھر بھی آسان ہوتے ہیں۔ کیا سہولت کی خاطر کوئی قوم اپنی زبان کو بدل دینے پر تیار ہوگی ؟ انگریزی والے اپنی بے اصولی املا کو بھی آج تک بدلنے پر آمادہ نہیں ہوئے ۔ پھر ہمارے رسم خط پر یہ لے دے کیا معنی' جب کہ طباعت کے جدید ترین طریقوں نے اب بعض دشواریوں کو بھی حل کر دیا ہے ؟

ان صفحات میں ہم نے اردو کے ساتھ ساتھ بعض ناگزیر ضروریات کے لئے ، روس کو رائج رکھنے کا مشورہ بھی وقتاً فوقتاً پیش کیا ہے ' اور وہ بھی غور طلب ہے۔ رومن کا جاننا جدید دنیا میں جہاں اسی کا دور دورہ ہے' ہر تعلیم یافتہ آدمی کے لئے لازم ہوگیا ہے ، بلکہ ہمارے لئے ایک مدت تک انگریزی کا جاننا بھی لازم ہوگا ۔ ہم اردو کے عام استعمال کے لئے ضروری سہولتیں فوراً مہیا نہیں کر سکتے لاکھوں ٹاپ رائٹر ایک دم کہاں سے لائینگے؟ لیکن اردو کا استعمال ان کی خاطر ملتوی نہیں کرنا چاہتے۔ بہت سی ایسی آبادی کو جو اردو حروف نہیں جانتی لیکن اردو کی شد بد رکھتی ہے ' ایک دم اردو حروف سکھانا بھی ممکن نہیں ۔ اس صورت میں سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ انگریزی کے ٹائپ رائٹر ' مختصر نویسی کی سہولت اور دوسری ساری فنی آسانیاں اردو کے تصرف میں لے آئی جائیں؟ ایک کی جگہ دو خطوں کے سہارے اردو زبان اشاعت پائے ۔ زبان کی بقا بہر حال مقدم ہے ۔ اب نہیں تو کبھی نہیں ۔ جب تک کہ اردو رسم خط کو ترک کرنا مقصود نہ ہو اور اس کے تحفظ کی پوری ضمانت موجود ہو' رومن کے جزوی استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں ' ایسے ہی جیسے کہ شارٹ ہینڈ یا ”مارس کوڈ“ یا تار برقی کے کھٹکوں کے ذریعے اردو الفاظ کو ادا کرنے سے کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا ۔

مرکزی ترقیٔ اردو بورڈ نے ضروری چھان بین کے بعد ایک ایسے ٹائپ رائٹر کا کلید بورڈ تجویز کیا ہے ۔ جو اردو اور مغربی پاکستان کی سب علاقائی زبانوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے ۔ سندھی اور پشتو کے ذمہ دار ادارے اس پر متفق ہوگئے ہیں ۔ انہوں نے اپنے اپنے رسم الخط میں بعض حروف و علامات کم کر دی ہیں تاکہ اردو اور ان زبانوں کا رسم الخط یکساں ہو جائے۔ ان کا یہ تعاون نہایت قابل قدر ہے ۔ مشرقی پاکستان میں بھی ”حروف قرآن“ کی تحریک ایک مدت سے جاری ہے ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ اس تحریک کو اور زیادہ فروغ ہوگا ۔

ش - ح - ح

اُردو کی آوازیں

ڈاکٹر گیان چند

اردو نامے کے شمارہ ۱۴، بابت اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۳ء میں بھبی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون ''اردو کی بنیادی اور ذیلی آوازیں'' نظر فروز ہوا۔ اسی موضوع پر میرا ایک مضمون 'اردو کی آوازیں' رسالہ' اردو ادب علی گڑھ، شمارہ ۴، بابت ۱۹۶۱ء میں شائع ہوچکا ہے۔ واضح ہو کہ اردوادب کا یہ شمارہ اوائل جنوری میں آیا تھا۔ ڈاکٹر نارنگ نے اردو آوازوں کے تجزیے میں اکثر وبیشتر میری تائید کی ہے لیکن بعض مقامات پر میرے تجزیے سے اختلاف بھی کیا ہے۔ ان اختلافی نکات پر ان کے اور میرے بیچ بالمشافہ تبادلۂ خیالات بھی ہوچکا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ میرے ہم خیال ہو گئے، لیکن ان کے مضمون سے معلوم ہوا کہ وہ ابھی قائل نہیں ہوئے۔ لہٰذا حقِ جواب کے طور پر میں اپنے اختلافی نظریات کی تفصیل اہل نظر کے سامنے پیش کردینا چاہتا ہوں۔ ان سطور میں غیر اہم اختلافات کو نظر انداز کردیا جائے گا۔

(۱) ڈاکٹر نارنگ کو اختلاف ہے کہ پھ۔ بھ وغیرہ منفوس (ہکاری یا ہائیہ) آوازوں کو مرکب نہ قرار دیا جائے کیونکہ یہ اعضائے صوت کی ایک ہی جنبش سے ادا ہوتی ہیں۔

ہم اس اعتراض کو یقیناً تسلیم کرلیتے لیکن ڈاکٹر نارنگ نے بجا طور پر ان آوازوں کی مشترک تنفیس (aspiration) کو صوتیہ /ہ/ کی ایک ذیلی صوت [ہائے مخلوط کامل] قرار دیا ہے۔ اب جب کہ بھ دو صوتیوں /ب/ اور /ہ/ کا مجموعہ ہے تو اسے مرکب آواز کیوں نہ کہا جائے' مفرد کیوں کہیں؟ اگر ڈاکٹر نارنگ پھ۔ بھ۔ وغیرہ کو الگ الگ صوتیہ مانتے تو انہیں ان آوازوں کو مفرد کہنے کا حق تھا۔

(۲) ڈاکٹر نارنگ اور میرے درمیان سب سے اہم اختلاف وصلی ن [homorganic n] کا ہے۔ /م/ کے علاوہ ہم نے دو غنائی مصمتوں /ن/ اور /نٓ/ (یعنی ںؔ) کو صوتیوں کا مرتبہ دیا تھا۔ فصلی ن اور وصلی ن کو /ن/ کی ذیلی آواز قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر نارنگ نے فصلی ن اور وصلی ن کو علاحدہ علاحدہ صوتیہ

مانا ہے اور (نؔ) کو /وصلی ن/ کی ایک ذیلی صوت قرار دیا ہے ۔ ان کے اس فیصلے کو ذرا تفصیل سے دیکھنے کی ضرورت ہے ۔

جہاں تک صوتیوں کی تعداد کا تعلق ہے ' نارنگ صاحب اور میں دونوں ن اور نؔ کی تمام آوازوں کو دو ہی صوتیوں میں اسیر کر پاتے ہیں ۔ اب اختلاف صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ن کو وصلی ن کی ایک ذیلی صوت سمجھا جائے کہ علاحدہ صوتیہ ۔

[ن] کے نقطۂ تلفظ میں نوک زبان اوپری مسوڑے کو چھوتی ہے ۔ اوپری مسوڑا [ن] کا بنیادی نقطۂ تلفظ ہے لیکن بعض متعاقب مصمتوں کی ہمدردی میں یہ نقطۂ تلفظ تھوڑا بہت آگے پیچھے سرک سکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ نقل مکان بنیادی نقطے کے آس پاس ہی رہنا چاہیے ' زیادہ دور نہیں ۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ کوئی بالکل مختلف آواز ادا نہ ہوجائے ۔ میری رائے میں یہ انتقال بنیادی نقطے سے ایک درجہ نیچے یعنی اوپری دانت یا ایک درجہ اوپر یعنی نرم تالو تک جائز ہے ۔ [ن] کے تلفظ میں [articulator] (تلفظ کا رآلہ) زبان کا پچھلا حصہ ہے اور نقطۂ تلفظ غشا یعنی نرم تالو ۔ (الف) نوک زبان اور اوپری مسوڑے اور (ب) زبان کے پچھلے حصے اور نرم تالو میں بعدِ مشرقین ہے ۔

سچ تو یہ ہے کہ نؔ کسی طرح ن سے ہی نہیں ۔ اردو ہندی کے رسم الخط سے گمراہ نہ ہوئیے ۔

میرے دوست نارنگ صاحب نے فصلی اور وصلی ن کو علاحدہ صوتیے قرار دے کر ان بے چاری آوازوں پر کتنا ستم کیا ہے ' اس کا انہیں اندازہ نہیں ۔ بن اور بنتا کی ن میرے نزدیک ایک خاندان سے ہیں لیکن نارنگ صاحب کے خیال کے مطابق ان دونوں میں کوئی مماثلت کوئی ربط و رشتہ ہی نہیں ۔ یہ زبان ہے سانچے کو مجروح کرنا ہے ۔

بن کی ن نوک زبان اور اوپری مسوڑے سے ادا ہوتی ہے ۔ بنتا کی ن نوک زبان اور اوپری دانتوں سے ادا ہوتی ہے ۔ دنگا کا غنائی مصمتہ زبان کے پچھلے حصے اور نرم تالو (تالو کا پچھلا حصہ) کے میل کا نتیجہ ہے ۔ نارنگ صاحب جن دو آوازوں (بنتا اور دنگا کے غنائیے) کو ایک کنبے میں رکھتے ہیں ۔ ان کے [articulator] اور مقام تلفظ دو انتہاؤں پر واقع ہیں لیکن اس کے برعکس وہ بن اور بنتا کے ن کو جن کا تلفظ کار آلہ مشترک ہے اور مقام تلفظ میں محض ایک درجے کا فرق ہے علاحدہ قرار دیتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ صوتی مماثلت کا تقاضا یہی ہے کہ بن اور بنتا کے ن کو ایک گروہ میں رکھا جائے اور دور افتادہ دنگا کے غنائیے کو دوسرے گروہ میں ۔

اپنے انگریزی رسالے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بھی فصلی اور وصلی ن کو مختلف آوازیں قرار دیا تھا اور نؐ کو وصلی ن کی ایک قسم، لیکن چونکہ انہوں نے اس مقام پر صریحاً صوتیوں اور ذیلی اصوات کی بحث نہیں کی، اس لئے ہمیں ان سے تعرض نہیں۔ نارنگ صاحب وصلی ن کو تو /ن/ کی آغوش سے چھین رہے ہیں اور نؐ کو وصلی ن کے ساتھ نتّھی کر رہے ہیں لیکن عنبر اور گمبھیر کے وصلی م کو /م/ ہی کے بازو میں رہنے دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے یہاں اتنی تو منطقیت تھی کہ اگر نؐ کو وصلی ن کی شاخ قرار دیا تھا تو وصلی م کو بھی وصلی ن کے ساتھ وابستہ رکھا تھا۔ ڈاکٹر نارنگ کی طبیعت وصلی م کو /ن/ کے ساتھ وابستہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئی لیکن اردو رسم الخط کے بھلاوے میں وہ نؐ کے ساتھ انصاف نہ کرسکے۔ میری رائے میں نؐ، ن سے اسی قدر متفاوت ہے جس قدر گمبھیر کا [م]۔

اب میری تائید میں چند اسناد ملاحظہ ہوں۔ مندرجۂ بالا تمام آوازیں انگریزی میں بھی ہیں:

وصلی م ۔ jumbo , jump

وصلی ن ۔ hence, inch, hand, hunt

نؐ ۔ ring, ink

ک گ سے پہلے فصلی ن ۔
ingredient, inculcate, incorrect

لیکن انگریزی کے مشہور ماہرین صوتیات ڈینیل جونس(۱) اور گلیسن(۲) /نؐ/ کو صریحاً /ن/ سے مختلف صوتیہ قرار دیتے ہیں اور وصلی ن اور فصلی ن کے اختلاف کو درخور اعتنا بھی نہیں سمجھتے۔ یہی حال ہندی کے علما کا ہے۔ ڈاکٹر اودے نراین تواری(۳) /نؐ/ کو ہندی کا صوتیہ مانتے ہیں۔ وصلی ن یعنی انوسوار کو صوتیے کا مقام نہیں دیتے۔

اردو ادب میں شایع شدہ مضمون میں میں نے ہم مخرج (وصلی) ن اور منفصل یا مکمل اعلان کے ن میں امتیاز کیا ہے لیکن اس میں بعض تسامح ہوگئے ہیں۔ ڈاکٹر اشوک کیلکر ریڈر تجزیاتی لسانیات دکن کالج پونا نے مجھے بتایا تھا کہ

۱۔ ہم مخرج ن (homorganic n) صرف بعض اسپھوٹ مصمتوں کے قبل آتی ہے۔

۲۔ یہ فصلی ن سے مختلف آواز نہیں ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں ان کے پہلے اصول کی خلاف ورزی کی یعنی س۔ ش۔ ز سے پہلے آنے والے ن کو بھی ہم مخرج قرار دیا

1 English Phonetics, ed. 1956 P. 170

2 An Introduction to Descriptive Linguistics, ed. 1961 P. 50

(۳) بھاشا شاستر کی روپ ریکھا (ہندی میں) از ڈاکٹر اودے نراین مطبوعہ جولائی ۱۹۶۳، صفحہ ۱۱۷

جس کی وجہ سے میں اغلاط کے پیچاک میں پھنس گیا۔ ڈاکٹر نارنگ بھی انہیں غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ بناسب یہ ہے کہ ن کی ذیلی اصوات کا پتا لگایا جائے۔

ہم مخرج ن، اس 'ن' کو کہتے ہیں جو اپنے متعاقب اسپھوٹوں کے نقطہ تلفظ سے ادا ہو۔ نوک زبان 'ن' اور اس کے بعد والے اسپھوٹ مصمتے دونوں کو ایک مقام سے ادا کرکے ہی ہٹتی ہے۔ نوک زبان کی بازی گاہ محدود ہے یعنی دانتوں سے لے کر تالوتک۔ اس طرح اردو میں میں صرف:

ت۔ تھ۔ د۔ دھ۔ ٹ۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ۔

ج۔ چھ۔ ج۔ جھ

کے پہلے آنے والا 'ن' ہم مخرج ہوتا ہے۔ بقیہ تمام مصمتوں سے قبل آنے والے 'ن' کوہم فصلی ن کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مصوتوں سے قبل آنے والے 'ن' یا لفظ کے آخر میں آنے والے 'ن' پر 'فصلی' (non - homorganic) کا اطلاق بے معنی ہے۔ وصل یا فصل بعد میں آنے والے مصمتے ہی کے ساتھ ہوسکتا ہے، جب اس کا وجود ہی نہیں تو فصل کس سے۔ 'ن' کی ذیلی اصوات محض اس بنا پر طے کرنی ہوں گی کہ ان کا نقطہ تلفظ کیا ہے، وصل و فصل کی بنا پر نہیں۔ ایک انگریزی مثال لیجیے shun اور shunt ، میرے سابق اور نارنگ صاحب کے موجودہ تجزیے کے مطابق shun کا [n] فصلی اور shunt کا [n] ہم مخرج۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ دونوں سو فی صدی لثوی (اوپری مسوڑے سے متعلق) مصمتے ہیں، ہم انہیں کس طرح مختلف ذیلی اصوات قرار دے سکتے ہیں۔ اردو میں بن اور ہنس (ایک چڑیا) ایسی مثالیں ہیں۔ واضح ہو کہ ہم 'بم' اور 'پمپ' کے 'م' کو وصلی اور فصلی میں تقسیم نہیں کرتے۔ میں نے صوتیوں اور ذیلی اصوات سے متعلق کسی انگریزی یا ہندی تحریر میں وصلی اور فصلی ن کی تقسیم نہیں دیکھی۔ اس کے برعکس

ঙ (ŋ) کو ہمیشہ ایک آزاد صوتیہ دکھایا جاتا ہے۔ سلجھا ہوا اور منطقی طریق کار یہ ہے کہ ہم محض نقطہ تلفظ(۱) کی بنا پر 'ن' کی مختلف اقسام قائم کریں جو یوں ہوں گی۔

۱۔ [دنتی ن]۔ ت۔ تھ۔ د۔ دھ سے پہلے

۲۔ [معکوسی ن]۔ ٹ۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ سے پہلے

۳۔ اعقب لثوی ن] ش سے پہلے

۴۔ تالوئی ن] چ۔ چھ۔ ج۔ جھ سے پہلے

۵۔ [لثوی ن] بقیہ سب موقعوں پر یعنی

(الف) بقیہ سب مصمتوں سے قبل مثلاً منفی۔ تنکا۔ کنبہ۔ انسان۔ منشی۔ منہا

(ب) مصمتوں سے قبل مثلاً نور۔ بنا

(ج) لفظ کے آخر میں مثلاً گردن

---

(۱) میرے لسانی مضامین کا مجموعہ 'لسانی مطالعے' زیر طبع ہے۔ وہاں میں نے اسی بنا پر تقسیم کی ہے۔

یہ سب قسمیں آپس میں تکملی بٹوارے میں ہیں۔ ہم اس تقسیم کو آگے بڑھا کر ڈنکا کی نٓ کو اغشائی ن] نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ تِنکا کی [لثوی ن] کے تضاد میں ہے۔

(۳) ژ۔ ڈاکٹر نارنگ ژ سے خفا ہیں۔ وہ اسے صوتیے کا رتبہ نہیں دینا چاہتے۔ میں نے ظرف اور ژرف کا ایک اقلی جوڑا پیش کیا تھا۔ نارنگ صاحب لکھتے ہیں:

ایک تو یہ صحیح معنوں میں اقلی جوڑے نہیں، دوسرے اس قسم کے الفاظ بھی اردو میں بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔

عرض ہے کہ ظرف اور ژرف ہر معنی میں مکمل اقلی جوڑا ہے۔ رہی کمی استعمال کی بات تو وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اگر فرہنگ زبان میں ایک اقلی جوڑا بھی مل جائے تو وہی صوتیے کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ ہم اس سے چشم پوشی نہیں کرسکتے۔ ذیلی آوازوں کے لئے ڈینیل جونس(۱) لکھتا ہے:

No one member ever occurs in a word in the same phonetic context as any other.

اگر ژ اور ز کو ہم صوت قرار دیا جائے تو دونوں کے وقوع کا جداگانہ ماحول کیونکر طے ہوگا، ظرف (ظ = ز) اور ژرف میں دونوں کا ماحول یکساں ہے۔ ایک اور مکمل اقلی جوڑا ''زیاں'' اور ''ژیاں'' ہے۔

۴۔ تین خفیف مصوتے۔ اگر زیادہ موشگافی میں نہ جاکر اردو میں محض ۱۳ مصوتے فرض کیے جائیں تو دس مشہور مصوتوں کے علاوہ ذیل کے تین مصوتے اور ملتے ہیں جنہیں میں نے اولاً خفیف آے (کہنا میں)، خفیف اِے (سہرا میں) اور خفیف آو (تحفہ میں) کہا تھا لیکن چونکہ طویل اِے اور طویل آو کو اردو میں یائے مجہول اور واؤ مجہول کہا جاتا ہے اس لئے ان کی مناسبت پر خفیف اِے کو زیرِ مجہول اور خفیف آو کو پیش مجہول کہنا بجا ہوگا۔ ان کے مقابلے میں کِس کے زیر کو زیرِ معروف اور گُل کے پیش کو پیشِ معروف کہیں گے۔ انہیں کی مماثلت پر خفیف اے کو زیرِ مجہول کہہ سکتے ہیں۔ اب ڈاکٹر نارنگ کے تین بیانات (ص ۱۸) ملاحظہ ہوں:

(ا) یہ تینوں مصوتے چونکہ بالترتیب زبر، زیر اور پیش کی خفیف شکلیں ہیں۔

(ب) اور ان کے جلی لہجے میں آزادانہ تغیر کا رشتہ ہے۔

(ج) اس لئے انہیں فونیم کا درجہ حاصل نہیں بلکہ خفیف زبر کو زبر کی، خفیف زبر کو زبر کی اور خفیف پیش کو پیش کی ذیلی صوت

(۱) The Phoneme, its nature and use, 1949 P. 10

تسلیم کیا جاتا ہے۔

پہلے لیجیے (الف) کو۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

مجہول	معروف
اہل	اصل
احترام	انتظام
عہدہ	عمدہ

مجہول شکلیں کسی طرح معروف مصوتوں سے خفیف نہیں۔ اگر ان سے زیادہ طویل نہ ہو تو کم از کم برابر ضرور ہیں۔ انہیں زبر، زیر، پیش کی خفیف شکلیں نہیں قرار دیا جاسکتا۔

(ب)۔ جہاں تک زیر کا تعلق ہے، مجہول زیر کو بعض خطّوں میں معروف کے طور پر بولا جاتا ہے یعنی ان دونوں میں آزادانہ تغیر کا رشتہ ہے لیکن زیر اور پیش کی دونوں قسموں میں آزادانہ تغیر نہیں۔ احترام، محنت، عہدہ، کرام کو کوئی بھی زیر معروف اور پیش معروف سے نہیں بولتا۔

(ج)۔ اب لیجیے ان کی صوتیائی حیثیت۔ اول یہ عرض کروں کہ ڈاکٹر نارنگ نے زیرِ مجہول کی جو تین آوازیں درج کی ہیں، ان میں سے (ب) اور (ج) سے میں واقف نہیں۔ میں نے کسی کو بحث اور محل وغیرہ میں ح کے بعد زیرِ مجہول بولتے نہیں سنا۔ نہ ہی بحث، زہر، لہر کی ہ متحرک ہے۔ کاش نارنگ صاحب واضح کر دیتے کہ انہوں نے کس علاقے کے باشندوں کے تلفظ کو پیش نظر رکھا ہے۔ میں اپنے مضامین میں کھڑی بولی کے علاقے یعنی مغربی یو۔ پی کی معیاری اردو کا تجزیہ کیا کرتا ہوں۔

مجھے تسلیم ہے کہ زیرِ مجہول اور زیرِ معروف ایک دوسرے کے ہم صوت ہیں لیکن جہاں تک زیرِ مجہول اور پیشِ مجہول کا تعلق ہے یہ نا مراد آوازیں اپنی صوتیائی حیثیت منوانے پر تلی ہیں۔ پہلے زیرِ مجہول کو لیجیے۔ ذیل کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

دِہ (بہ‌معنی دس)۔ دیہہ (بہ‌معنی گاؤں) دردِسر (ع خداوندا خدائی دردِ سر ہے)۔ پِسر، سانحہ، رِہا۔ آئے (ع آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالب)۔ آئی (ع: دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی)۔ آئے اور آئی کے اقلی جوڑوں اور دردِ سر اور پسرِ کے مماثل جوڑوں نیز سانحہ اور رِہا سے ثابت ہے کہ زیرِ مجہول اور زیرِ معروف ایک ماحول میں آسکتے ہیں۔ واضح ہو کہ دردِ سر میں درد کے آخر میں کسی قسم کا توقف نہیں ہوتا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ دردِ سر کو ہم طویل اِے سے دردے سر بھی بولتے ہیں اس

لئے زیرِ مجہول کو طویل اِےَ کا ہم صوت قرار دے سکتے ہیں تو دہ اور دیہہ کا اقلی جوڑا مانع آتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ زیرِ مجہول زیرِ معروف سے جدا صوتیہ قرار پائے گا۔

پیشِ معروف کو لیجیے۔ وہاں بھی یہی عالم ہے۔ ذیل کی مثالوں پر نظر کیجیے:

آب و گل (ع: پر جو معشوقی آب و گل میں ہے)۔ بکَا

تاو (پیشِ مجہول کے ساتھ)۔ تاو (پیش معروف سے بہ‌معنی باپ کا بڑا بھائی)۔

ان مماثل اور اقلی جوڑوں سے ثابت ہے کہ پیش کی یہ دونوں شکلیں صوتیہ کہلانے پر مصر ہیں۔ اس تجزیے سے زیرِ مجہول کے علاوہ اردو کے بارہ مصوتے صوتیے کا رتبہ پاتے ہیں۔ اگر میرا طریقہ بروئے کار لایا جائے یعنی /طول/ کو۔ ایک علاحدہ صوتیہ قرار دے دیں تو بغیر کسی الجھن کے اردو میں محض سات مصوتے صوتیے کا درجہ لیں گے۔ کفایت کا یہ طریقہ نیا نہیں ہے۔ انگریزی میں بھی طویل مصوتوں کی صوتیائی حیثیت سے انکار کی مثالیں ملتی ہیں۔

۵۔ مصوتی غنائیت۔ اس کی تفصیل میں نے اردو ادب کے مضمون میں پیش کی ہے۔ بعد میں اس پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ ترمیم شدہ تجزیہ زیر طبع مجموعے 'لسانی مطالعے' میں درج ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کا بیان میرے سابق تجزیے پر مبنی ہے۔ گلیسن(۱) کے مندرجۂ ذیل مشاہدے نے میرے تجزیے کی خامی افشا کی:

"Perhaps more common are prenasalised stops. In these the oral closure slightly precedes the velic closure The result impresses Americans often as a stop preceded by a short homorganic nasal [ᵐb] [ⁿt], etc."

مثال کے طور پر دو لفظ لیجیے۔ طنبورہ، بندھا۔ یہاں ب اور د سے پہلے ہی خفیف سا غنائی مصمتہ شامل ہو جاتا ہے۔ غنائی مصمتے کے شمول کے معنی یہ ہیں کہ منہ سے ہوا کا اخراج بند ہوگیا لیکن ناک کے راستے تنفس باہر نکلتا رہا۔ مصوتہ اس آواز کو کہتے ہیں جس کے ادا میں منہ سے بے روک ٹوک سانس باہر نکلتا رہے۔ جب منہ کا راستہ بند ہو گیا تو مصوتہ اور مصوتی غنائیت کہاں رہی۔ یہ تو خالص غنائی مصمتہ ہوگیا جو اپنی نوعیت میں (الف) خفیف ہے اور (ب) مابعد اسپھوٹ کے ساتھ ہم مخرج ہے۔ اس خفیف ہم‌مخرج غنائیے (short homorganic nasal)

(۱) An Introduction to Descriptive Linguistics, ed 1961 P. 249

کی مختلف قسمیں مصوتی غنائیت کے ساتھ اس طرح ہم صوت ہیں :

١ - [خفیف ہم مخرج م] - ب ، بھ سے پہلے - طنبورہ ، سانبھر

٢ - [خفیف ہم‌مخرج دنتی ن] - د ، دھ سے پہلے - سندیسا ، باندھا

٣ - [خفیف ہم مخرج معکوسی ن] - ڈ - ڈھ سے پہلے - منڈیر ، مینڈھا -

٤ - [خفیف ہم مخرج تالوئی ن] - ج - جھ سے پہلے - منجیرا ، مانجھا -

٥ - [خفیف ہم مخرج نٛ] - گ - گھ سے پہلے - منگانا ، سونگھا -

٦ - [مصوتی غنائیت] - بقیہ‌سب‌موقعوں‌پر ان تمام اصوات کو ہم ایک صوتیہ /غنائیت/ کے تحت رکھیں گے - اس طرح یہ‌واضح ہو گیا کہ جسے مخلوط مصوتی غنائیت کہا گیا تھا وہ دراصل غنائی مصوتہ نہیں ، غنائی مصمتہ ہے -

ڈاکٹر نارنگ کی دی ہوئی مثالوں میں چاند ، گوندھ ، گونڈ ، گونج ، سانجھ، ٹانگ ، سونگھ میں خفیف ہم مخرج غنائیہ نہیں ، پورا غنائیہ ہے - اگر ان میں خفیف غنائیہ (سابق اصطلاح میں مخلوط مصوتی غنائیت مان‌لیں تو پھر غیر مصیتی مصمتوں‌سے قبل مثلاً امرکانت - فلسفی کانٹ - مانس (گوشت کے معنی میں ہندی لفظ) میں بھی اس کاوجود ہوجاتا ہے یعنی ہماری تقسیم کی بنا ہی درہم برہم ہوجاتی ہے -

(٦) و - نیم مصوتوں کے لئے نارنگ صاحب لکھتے ہیں :

” آخری حالت میں نیم مصوتے کی حیثیت سے ان کا (یعنی و - ی) کا تلفظ اردو زبان کے صوتی مزاج کے خلاف ہے - “

ی کی حد تک یہ صحیح ہے ، و کے لیے محلِ نظر ہے - ملاحظہ ہوں اردو الفاظ لغو، حشو ، ھجو وغیرہ - نارنگ‌صاحب نے / و/ کی تین ذیلی‌اصوات لکھی‌ہیں - [لب دنتی و] ، [دولبی و] اور [لب دنتی خفیف و] - میری رائے میں آخری آواز کا وجود نہیں - لکھتے ہیں 'یہ دو مصوتوں کے درمیان آتی ہے مثلاً خواب - خواہ - سوانگ - عرض ہے کہ خواب اور خواہ میں و محض اردو رسم الخط کی حد تک ہے، تلفظ میں اس کا وجود نہیں - تلفظ خاب اور خاہ ہے - سوانگ میں و سے پہلے کوئی مصوتہ نہیں 'س' ہے - ڈاکٹر بابو رام سکسینہ(١) اسے [دولبی و] قرار دیتے ہیں لیکن میرا تلفظ اسے معمولی [لب دنتی و] ہی ٹھہراتا ہے - اب میں / و/ کی دونوں قسموں کا بٹوارا یوں کروں گا :

١ - [دولبی و] لفظ‌کےدرمیان محض پیشِ معروف کے بعد آتی ہے - مثلاً جوا - کنوئیں

(١) سامانیہ بھاشاوگیان (ہندی میں) طبع ششم ص ٩٥

٢- [لب دنتی و] بقیہ سب موقعوں پر مثلاً وعدہ ، دوا ، ھجو۔

جس طرح ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا ہے اِسی طرح ایک غلطی دوسری غلطی کا موجب بن سکتی ہے۔ میری سابقہ تحریروں کے بعض اغلاط نے ڈاکٹر نارنگ کو بھٹکا دیا۔ اسی وجہ سے میں نے ضروری سمجھا کہ ان اغلاط کی صراحت کر کے معاملہ صاف کر دوں تاکہ قارئین کے سامنے ایک صحیح تصویر آسکے۔ ڈاکٹر نارنگ امریکہ میں اپنے فرائض منصبی کے علاوہ لسانیات کا مطالعہ بھی کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اردو لسانیات میں ان منازل کو قطع کرسکیں گے جو ہم میں سے اکثر کے لئے ممکن نہیں۔

ایک یادگار تالیف

اور

نونہالوں کے لئے نادر تحفہ

پھول

یعنی اخبار "**پھول**" لاہور کی ۵۰ سال کی جلدوں کا آسان انتخاب

مرتبہٴ غلام عباس

برائے

ترقیٴ اُردو بورڈ، کراچی

ناشر

سجاد کامران، کراچی

صفحات ۲۸۰ - دیدہ زیب طباعت و سرورق - قیمت ٦ روپے

چند لکھنے والے

سید احمد شاہ بطرس، بخاری خواجہ حسن نظامی ، مولانا عبدالمجید سالک ، مرزا عظیم بیگ چغتائی، امتیاز علی تاج، سوکت تھانوی، نذر سجاد حیدر ، قرۃالعین حیدر، اختر شیرانی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر ، حامد حسن قادری، چراغ حسن حسرت ، ابوالاثر حفیظ جالندھری، مجید لاہوری ، احمد ندیم قاسمی ، قیوم نظر اور دوسرے حضرات۔

لفظ صوفی کی تحقیق

قدرت نقوی

ہماری قومی اور علاقائی زبانوں میں دنیا کی بیش‌تر زبانوں کے الفاظ شامل ہو کر آج ہماری زبانوں کا سرمایہ بن چکے ہیں، اس لئے کسی لفظ کا ماخذ تلاش کرتے وقت ہمیں مختلف زبانوں کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ تحقیق الفاظ کی منزل بڑی کٹھن ہے۔ صرف صوتی مشابہت یا معنوی مطابقت دیکھ کر یہ لکھ دینا کہ فلاں لفظ فلاں زبان سے ماخوذ ہے، کافی نہیں ۔ تحقیق الفاظ کے سلسلے میں صوتی مشابہت یا معنوی مطابقت زیر بحث ضرور آتی ہے۔ مگر کلیتہً ان ہی تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ تاریخ پر بھی نظر رکھنی چاہیے، اس کی آمد کے راستے اور مواقع بھی سامنے آنے ضروری ہیں۔ قواعد زبان کو اصول و ضوابط کے ذریعے سے بھی پرکھنا چاہیے۔ اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ دوسرے کیا کہتے ہیں ؟ بطور نمونہ لفظ ''صوفی'' کی تحقیق پیش کی جاتی ہے، اسی سے قیاس کرلینا چاہیے کہ تحقیق الفاظ کی منزل کتنی دشوار گزار ہے۔

لفظ صوفی کے متعلق عموماً دو قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ لفظ عربی الاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ یونانی زبان کا لفظ ہے۔ غالباً اردو میں سب سے پہلے مولانا شبلی نے صوفی کو یونانی الاصل لکھا ہے۔ انہوں نے یہ بات ابوریحان البیرونی کی 'کتاب الہند' سے اخذ کی ہے:

''اس بحث کے خاتمے میں یہ بات بھی ظاہر کردینا ضرور ہے کہ. تصوف اصل میں سین سے تھا اور اس کا مادہ سوف تھا جس کے معنی یونانی زبان میں حکمت کے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ لفظ عربی زبان میں آیا۔ چونکہ حضرات صوفیہ میں اشراقی حکما کا انداز پایا جاتا تھا، اس لئے لوگوں نے ان کو سوفی یعنی حکیم کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ سوفی سے صوفی ہوگیا۔ یہ تحقیق علامہ ابوریحان البیرونی نے کتاب الہند میں لکھی ہے۔'' (الغزالی ص۲۷۷)

مولانا کے اس انکشاف راز میں کئی باتیں محل نظر ہیں۔ '' تصوف '' مصدر ہے باب تفعّل کے وزن پر منصرف ہے ۔ سین کے صاد میں تبدیل ہونے کا کوئی سبب اور قرینہ بیان نہیں کیا گیا۔ یونانی سوف کے معنی بھی مولانا شبلی نے صحیح نہیں لکھے، کیونکہ یونانی میں بہ‌معنی دانش سوفیہ (Sophis) ہے۔ (چیمبرز ڈکشنری ص۱۰۰۶) اور سوف (Sophos) بہ معنی دانشور ہے (چیمبرز ڈکشنری ص۱۰۲۹)۔ فلسفے کی کتابوں کے زیادہ تر تراجم بھی مامون الرشید کے عہد میں ہوئے ہیں جن کا تعلق تیسری صدی ہجری سے ہے۔ مفصل بحث آگے کی جائے گی۔ مولانا شبلی کی تحریر کا ماخذ البیرونی کی یہ عبارت ہے :

''هذارای السوفیه" وهم الحکما" فان‌سوف بالیونانیه" الحکمه" وبهاسمی الفیلسوف پیلاسوپا

ای محب الحکمۃ" و لماذھب فی الاسلام قوم الیٰ قریب رایئھم سموابا سمھم ولم یعرف اللقب بعضھم فنسبھم للتوکل الی الصفہ" وانھم اصحابھا فی عصر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم صحف بعد ذالک فصیرمن صوف التیوس وعدلی ابوالفتح البستی عن ذالک احسن عدول فی قولہ :

تنازع الناس فی الصوفی واختلفوا

قدما وظنوہ مشتقاً من الصوف

ولست انحل ھذا الاسم غیر فتی

صافی وصوفی حتی لقب الصوفی

[تحقیق ماللھند ص ۱۶ طبع لیپزک بحوالۂ سبک شناسی ج ۲ ص ۱۷۸]

(یہ رائے سوفیوں کی ہے جو حکیم ھیں کہ یونانی میں سوف حکمت کو کہتے ھیں اور لفظ فیلسوف جس کو 'پیلا سوپا' کہتے ھیں اسی سے ہے یعنی دوست‌دار حکمت۔ اور جب اسلام میں ایک گروہ نے ان کی رائے سے موافقت کی تو اپنے لئے یہی نام اختیار کیا۔ اور ایک گروہ نے نادانستہ اس لقب کو اھل صفہ سے منسوب کردیا۔ توکل کی وجہ سے' جو ان میں تھا اور بہ اھل صفہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ھوئے ھیں۔ پس اس میں تصحیف ھوئی اور اس کو بھیڑ بکریوں کی اون سے منسوب کردیا۔ ابوالفتح بستی نے بڑے اچھے پیرائے میں اس نسبت سے انحراف کیا ہے ,,آدمی لفظ صوفی کے متعلق جھگڑتے ھیں اور اختلاف کرتے ھیں۔ قدیم زمانے میں اس کو اون سے مشتق خیال کیاھے۔ میں اس نام کا کوئی جوان مرد نہیں جانتا ماسوا اس کے جو صاف تھا، صفائی حاصل کی اور وہ ملقب بہ‌صوفی ھوا''۔)

ابو ریحان بیرونی نے ابوالفتح بستی کے جن اشعار سے انحراف کا پہلو مراد لیا ھے، انھی سے اس کے عربی الاصل ھونے پر بھی استدلال کیا جاسکتا ھے کیونکہ ابوالفتح نے لکھا ھے کہ عہد قدیم میں اس کو صوف سے مشتق خیال کرتے تھے، مگر میرے نزدیک صوفی وہ ھے جو صاف ھو، صفائی حاصل کرچکا ھو۔ ابوالفتح کا مقصد یہ ھے کہ صرف لباس صوف سے صوفی نہیں بنتا بلکہ ظاھر و باطن کی صفائی سے صوفی بنتا ھے۔ گویا صرف لباس صوف دیکھ کر صوفی نہیں سمجھ لینا چاھیے بلکہ صفائی باطن کو ملحوظ رکھنا چاھیے۔ علامہ البیرونی اور مولانا شبلی کے علاوہ ملک الشعرا بہار نے بھی اس کو یونانی ھی سے ماخوذ لکھا ھے۔ (سبک شناسی ج ۲ ص ۲۷۹)

صوفی کو عربی الاصل بتانے والوں میں علمائے مشرق و مغرب شامل ھیں۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی لغات میں اس کو عربی الاصل لکھا گیا ھے۔ صراح اور منجد اس کو صوف (اون) سے مشتق قرار دیتے ھیں۔ اسی طرح آکسفورڈ، چیمبرز، ویسٹ منسٹرڈ کشنریوں میں اس کو عربی الاصل لکھا گیا ھے۔ علامہ ابن‌خلدون بھی اس کو صوف (اون) ھی سے

مشتق سمجھتے ہیں اور ان کے قول کی تائید مستشرقین میں سے پروفیسر نولکی (Noldeki)، نکلسن اور آربری کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔ تاریخ ادبیات ایران (ص ١٤١) میں ڈاکٹر شفق زادہ نے بھی صوف (اون) ہی سے صوفی مشتق لکھا ہے۔ ان شواہد کے بعد ہم اصول لسانیات کی روشنی میں اس لفظ کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ لفظ مرکب ہے، صوف اور یائے نسبتی سے، اس لئے صوف کی حقیقت اور اس کے ساتھ یائے نسبتی کا الحاق کے متعلق غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لفظ کی اصل کے متعلق چند نظریے ہیں، جن پر ذیل میں تبصرہ کیا جاتا ہے:

(١) بعض اس لفظ کو صُفّہ سے مشتق قرار دیتے ہیں کہ عہد نبوی میں جن لوگوں نے فقروفاقہ کی زندگی اختیار کی، اور عبادت الٰہی کو اپنا شیوہ بنایا، مسجد نبوی کے قریب ایک سایہ‌دار چبوترہ ان کا مسکن تھا، اس لئے وہ اہل صفہ کہلائے۔ آئندہ یہی طریق اختیار کرنے والوں کو صوفی کہا گیا۔ یہ تو درست ہے کہ فقر و فاقہ میں زندگی بسر کرنے والے اور عبادت الٰہی کو اپنا شیوہ بنانے والے صوفی کہلائے، مگر اصول اشتقاق کی رو سے لفظ صوفی اس سے ماخوذ نہیں ہوسکتا، کیونکہ الصُّفّۃ کے معنی ''گرمی کے لئے گھاس پھونس کا مکان'' ہیں اور جب مسجد کے ساتھ یہ لفظ آتا ہے تو صفۃ المسجد کے معنی ''مسجد کے قریب سایہ‌دار چبوترہ'' ہوتے ہیں۔ اول تو اس کے ساتھ یائے نسبتی کا الحاق ہی نہیں ہوتا، اسی لئے اہل الصفہ کہا گیا ہے۔ بنابریں صفہ سے صوفی نہیں اگر اس لفظ سے بنتا تو اہل صفہ ہی بنتا۔

(٢) بعض حضرات کا قول ہے کہ صوفی کی اصل ''صف'' (قطار) ہے۔ چنانچہ ابوالحسن نوری فرماتے ہیں:

''صوفی وہ لوگ ہیں جن کی روحیں آلائشوں سے پاک ہوچکی‌ہیں اور وہ پروردگار عالم کے حضور صف اول میں حاضر ہیں۔''

لیکن قاعدۂ اشتقاق کے مطابق صوفی، صف سے ماخوذ نہیں ہوسکتا، کیونکہ یائے نسبتی لگائی جائے تو صَفّی بنتا ہے، صوفی نہیں۔ علاوہ‌ازیں صف سے صفی بن تو جاتا ہے، مگر معنی میں التباس ہونے کی وجہ سے اہل عرب ''صفی'' استعمال نہیں کرتے بلکہ ''اہل الصف'' استعمال کرتے ہیں، اس لئے صوفی کا صف سے کوئی تعلق نہیں۔

(٣) بعض کا خیال ہے کہ صوفی ''صفا'' سے ماخوذ ہے جیسا کہ ذوالنون‌مصری فرماتے ہیں:

''تصوف قلب کو مخالفت (حق) کی کدورت سے پاک رکھتا ہے۔''

مگر اصول قواعد کے لحاظ سے ''صفا''

سے صوفی نہیں بنتا' قاعدے کے مطابق صفائی یا صفوی ہونا چاہیے۔ مگر اس کے ساتھ بھی یائے نسبتی کا الحاق مناسب نہیں سمجھا گیا، اور اہل الصفا ، اہل صفا ہی استعمال کرتے ہیں۔ پس صوفی ، صفا سے ماخوذ نہیں ہے۔

(۴) بعض صوفی کو "صاف" سے مشتق قرار دیتے ہیں۔ غالب نے لکھا ہے : "صوفیٔ صافی ہوں ہمه اوست کا دم بھرتا ہوں۔" مگر صاف سے صافی بنتا ہے ، صوفی نہیں۔

(۵) بعض اس لفظ کا مادہ صفی بتاتے ہیں، چنانچه کہا جاتا ہے "الصوفی صفی اللہ۔" (صوفی اللہ کا مخلص دوست ہے)۔ معنوی اعتبار سے درست، کیونکه یه گروہ اللہ کو دوست رکھتا ہے یا یه خیال کرتا ہے که ہمارا مخلص دوست اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ مگر قاعدے کے مطابق صفی سے صفوی بنتا ہے صوفی نہیں۔

یہاں یه ظاہر کردینا ضروری ہے که مندرجۂ بالا خیالات صوفی کے متعلق صفاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ صفاتی طور پر صوفی میں یه تمام باتیں یا ان میں سے کسی ایک کا پایا جانا ممکن ہے مگر لغوی اور لسانی حیثیت سے ان کا صوفی سے کوئی تعلق نہیں۔

(۶) بعض کا گمان ہے که یه یونانی سوفو Sophos بمعنی ماہر، دانشور اور عقلمند سے بنایا گیا ہے۔ میرے نزدیک یه سوفو سے به وجوہ ذیل ماخوذ نہیں ہوسکتا :

(الف) جب عربوں نے یونانی کتابوں کا ترجمه کیا تو انہوں نے فلسفه (Philos Sophia)، فیلسوف (Philos Sophos) اور سوفسط (Sophist) وغیرہ الفاظ لیے جن میں یونانی کے لفظ سوفو (Sophos) اور سوفیه (Sophia) شامل ہیں۔ قابل غور یه امر ہے که ان میں حرف 'سین' موجود ہے اس کو 'صاد' سے نہیں بدلا گیا۔ پس اگر صوفی بھی اسی سے ماخوذ ہوتا تو اس کا املا بھی "س" ہی سے ہوتا، ص سے نہیں۔

(ب) یونانی سوفو ، (Sophos) یعنی دانشور اور ماہر ، اس میں خود معنیٔ فاعلیت موجود ہیں ، جن کی موجودگی میں یائے نسبتی کا الحاق بےمعنی ہوجاتا ہے۔

(ج) اگر سوفو (Sophos) کی اصل سوفیه (Sophia) سے مشتق قرار دیں تو اولاً اس پر یائے نسبتی داخل ہونے کا قرینه ہی نہیں کیونکه یه مشخص و معین نہیں ہے۔ دیگر الفاظ سے ترتیب پاکر اصطلاح بنتا ہے، تنہا اصطلاح نہیں ہے۔ جیسا که لفظ فلسفه اور فیلسوف سے ظاہر ہے۔ اگر کوئی یه اعتراض وارد کرے که فلسفی میں بھی تو یائے نسبتی ہے تو اس کا جواب یه ہے که عربی میں فیلسوف ہے جو یونانی اصل کے مطابق ہے۔ فلسفی دراصل فلسفه پر یائے نسبتی کے الحاق سے بنا ہے۔ فیلسوف پر نہیں ، کیونکه عربی

میں فیلوسوفیہ (Philos Sophia) سے فلسفہ بنا ہے، اسی سے فلسفی بنالیا گیا۔ اس لئے سوفیہ (Sophia) سے بھی صوفی نہیں بن سکتا، اگر بنتا تو سوفیائی، سوفوی ہوتا اور اگر سوفی بن بھی جاتا تو س کا ص سے بدل جانے کا جو از کس طرح پیدا کیا جاسکتا ہے۔

(د) یہاں اس امر کی طرف اشارہ بے محل نہیں ہوگا کہ انگریزی میں تصوف کو مسٹیسزم (Mysticism) کہتے ہیں جو یونانی سے لاطینی کے ذریعے انگریزی تک پہنچا ہے۔ لاطینی مسٹی کز (Mysticus) کی اصل یونانی مسٹے (Mustes) ہے جو یونانی کے لفظ مائن (Muein) سے ماخوذ ہے۔ مائن (Muein) کے معنی یونانی میں آنکھیں اور ہونٹ بند کرنا ہیں۔ گویا حالت مراقبہ۔ پس تصوف کا معادل یونانی مسٹے (Mustes) یا اس کی اصل مائن (Muein) ہے۔ معنوی حیثیت سے تصوف اور صوفی کے لئے یہ الفاظ استعمال ہوسکتے تھے، جو نہیں ہوئے۔ جب یونانی میں، سوف یا سوفیہ، صوفی کے اوصاف ظاہری و باطنی میں سے کسی کی طرف راجع ہی نہیں تو پھر یہ صوفی کی اصل کس طرح قرار دئے جاسکتے ہیں؟ (Mystic) مسٹک، صوفی اور مجذوب کو کہتے ہیں۔ چنانچہ فارسی میں بھی مجذوب کو مست کہتے ہیں جو صوفی کے مدارج میں سے ایک درجہ ہے۔ فارسی اور یونانی، آریائی قبیلے کی زبانیں ہیں۔ اس لئے ''مسٹے'' اور مُست کی اصل اگر ایک ہی ہو تو کچھ بعید نہیں۔

(ے) فارسی میں ''سوفی'' اور ''سوف'' بہ‌معنی حکیم و حکمت ہیں۔ یہ دونوں لفظ یونانی سے آئے ہیں اور اسی طرح استعمال ہوئے ہیں، ان میں املائی تصرف نہیں کیا گیا۔ سوفی سے مراد فلسفی ہے۔ فلسفی اور صوفی میں کافی فرق ہے۔ تفصیلی بحث آگے کی جائے گی۔

(۸) علمائے مشرق و مغرب میں زیادہ تر ''صوف'' بہ‌معنی اون سے صوفی بہ‌معنی پشمینہ پوش بنائے جانے کے قائل ہیں اور از روئے اصول اشتقاق یہی درست بھی ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ یائے نسبتی کا الحاق قاعدے کے مطابق ہے۔

اب ہم اس لفظ کی اصل اور تعریف پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ لفظ عربی الاصل ہے، یونانی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ قابل غور یہ امر ہے کہ اگر یہ لفظ یونانی سے لیا گیا ہو تو اس میں املائی تبدل بتدریج واقع ہوتا لیکن جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے، صوفی سین سے (سوفی) لکھا ہوا نہیں پایا گیا۔ تصوف کی ابتدائی کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں اور ان میں بالاتفاق صوفی بہ‌صاد لکھا ہوا پایا گیا ہے۔

تصوف کی قدیم ترین کتابوں میں سے کتاب اللمع مصنفہ ابوالنصر عبداللہ بن علی السراج طوسی متوفی ۳۷۸ھ کا یہ اقتباس دیکھیے جس میں لفظ صوفی کے متعلق معلومات پیش کی

گئی ہیں:

''لفظ صوفی کی نسبت لفظ صوف سے ہے کہ انبیا، اولیا، اصفیا کا لباس تھا۔ جس طرح عیسیٰ کے حواری کہلاتے تھے جس کے معنی سفید لباس والوں کے ہیں۔ رسول اکرم کے زمانے میں اگر یہ لفظ نہیں ملتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابی سے بڑھ کر اور کوئی معزز لفظ نہ تھا۔ یہ غلط ہے کہ اہل بغداد نے اس لفظ کو اختیار کیا۔ حسن بصری اور صفیان الثاوری کے عہد میں بھی یہ لفظ رائج تھا اور تاریخ مکہ میں محمد بن اسحاق اور دوسروں کی سند پر روایت کی گئی ہے کہ یہ لفظ عہد اسلام سے پہلے بھی رائج تھا۔'' (کتاب اللمع ص ۲۱)

اس سے یہ بہ خوبی ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ لفظ اہل عرب کے لئے نیا نہ تھا بلکہ وہ اسی سے آشنا تھے۔ چنانچہ رسالۂ قشیریہ میں بھی یہی امر ہے۔ کشف الظنون اور نفحات میں لکھا ہے کہ یہ لقب سب سے پہلے ابوہاشم کوفی کے لئے استعمال کیا گیا۔ مولانا شبلی نے الغزالی (ص ۲۶۶) میں امام غزالی کا خیال لکھا ہے:

''امام صاحب موصوف نے ایک دوسرے موقعے پر تصوف کی تعریف کرتے ہوئے کہا، کہ اس لفظ کے اشتقاق کے متعلق تین رائیں ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو لوگ اہل صفہ کہلاتے تھے، یہ ان کی طرف نسبت ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا ماخذ صفا ہے، بعض کے نزدیک صف۔ لیکن قاعدۂ اشتقاق کی رو سے یہ تمام اقوال غلط ہیں۔ یہ احتمال ہوسکتا تھا کہ صوف سے ماخوذ ہو جس کے معنی پشمینہ کے ہیں، لیکن پشمینہ پوش ہونا اس فرقے کی کوئی خصوصیت نہیں۔''

امام غزالی کے اس قول سے مستنبط ہوتا ہے کہ ان کے عہد میں بھی صوفی کو صوف سے نسبت دی جاتی تھی، مگر وہ اس کو وقیع نہیں خیال کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے عہد میں تصوف ایک علمی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کا قول بھی ابوالفتح بستی کے اشعار کا ہم مفہوم ہے۔ '' صوفی لباس صوف سے نہیں بنتا بلکہ باطن صفا ہونا چاہیے۔'' اس سے بھی ظاہر ہے کہ صوفی کی صوف سے نسبت ظاہری تھی، اور یہ قول اہل ریا کے متعلق ہے جو لباس صوفیوں کا پہنتے تھے اور جن کا باطن صاف نہ تھا۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ صوفی حقیقتاً لباس صوف اور صفائی باطن کے حامل کو کہنا درست ہے۔

اب ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں جن میں صوفی کو لباس صوف سے منسوب کرنے کے شواہد پائے جاتے ہیں۔ اسرارالتوحید، جس میں شیخ ابوسعید ابوالخیر متوفی ۴۴۰ھ کے اقوال و اخبار و حالات لکھے گئے ہیں، کتاب مذکور میں صوفی مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے:

''ایک دن شیخ صوفیوں کی ایک جماعت کے ساتھ 'عدنی کو بان' محلے کے حمام میں گیا، اکثر اس کا معمول یہی تھا کہ اس حمام میں جایا کرتا۔ اس روز شیخ عمدہ رومی صوفی پہنے ہوئے تھا اور قیمتی پگڑی سر پر باندھے تھا۔ جب شیخ حمام سے نکلا، حجام وہاں کھڑا تھا... اس نے استاد سے پوچھا کہ یہ کون تھا؟ استاد نے بتایا کہ اسے شیخ ابوسعید ابوالخیر کہتے ہیں، صوفیؒ باکرامات بھی اور بزرگ بھی۔ وہ حجام اس گروہ کو نہ ماننے والوں میں سے تھا۔ اس نے کہا کہ اگر یہ صاحب کرامت ہو تو یہ صوف کا جبہ (خاص قسم کا کرتا) جو پہنے ہے اور یہ پگڑی مجھے دے دے کہ میں نے منگنی کی ہے اور مجھ سے بری (وہ سامان جو دولہا دلہن کو دیتا ہے) اور شادی کا سامان طلب کرتے ہیں، تاکہ رخصت کریں اور میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔''

عبارت بالا میں، ''صوفی'' بہ‌معنی اونی لباس، ''صوفی'' بہ‌معنی مرد عارف ہے۔ معنی اول کی تائید ''جبہؑ صوف'' سے ہوتی ہے۔ جبہ صوفیوں کے خاص قسم کے کرتے کو کہتے ہیں۔ اسی کتاب میں 'صوفی' کے علاوہ صوفی گری بہ‌معنی تصوف اور صوفی بہ‌معنی لباس صوف استعمال ہوا ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

''ایک وقت ایک گروہ عراق سے آیا اور ہمارے شیخ کے لئے ایک قبائے سہ چاک بہت عمدہ صوفیانہ حاشیہ دار لایا۔ جب شیخ کے سامنے اسے رکھا تو شیخ نے کہا کہ اسے میری کمر پر ڈال دو، شیخ کی کمر پر ڈال دی (پہنادی)۔ ایک بلی ہمیشہ شیخ کے پاس آتی اور سامنے رہتی۔ وہ بلی اٹھی اور شیخ کے گرد گھومی اور اس مرقع (لباس درویش و صوفی یعنی گدڑی) پر پیشاب کردیا۔ ہمارے شیخ نے کہا کہ میں اس خیال میں تھا کہ اپنے جسم پر سے صوفیوں کا لباس اتار ڈالوں اور تھوڑی دیر کے لئے صوفی بن جاؤں۔ اس بلی نے ہماری ''صوفی'' (لباس پشمینہؑ صوفی) پر پیشاب کردیا۔ اس قبائے سہ چاک کولو اور ابوالفتح کو دو کیونکہ صوفی وہی ہے۔''

ان دو مثالوں سے اس بات پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ لباس صوف، صوفیوں کا لباس تھا اور اسی کی وجہ سے ان کو صوفی کہا جاتا تھا۔ گلیم، مرقع، خرقہ، جبہ اس لباس کے مختلف نام تھے۔ تذکرۃ الاولیا میں ہے:

''(نوح) نے کہا کہ میری جواں‌مردی یہ ہے کہ قبا اتار ڈالوں اور مرقع پہن لوں اور مرقع پوشی کے طریقے اختیار کروں تاکہ صوفی ہوجاؤں اور مخلوق کی شرم کی وجہ سے اس لباس میں گناہوں سے پرہیز کروں۔''

اس میں بھی صوفی کی تمیز لباس ہی کی بہ‌دولت متعین کی گئی ہے۔ شیخ سعدی

فرماتے ھیں :

صاحب دلے بہ‌مدرسہ آمد زخانقاہ
بشکستہ عہد صحبت اھل طریق‌را

گفتم میان‌عالم وعابد چہ فرق بود
تا کردی اختیار ازاں دیں فریق‌را

گفت‌او گلیم‌خویش بدرمی‌برد زموج
ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق‌را

اس میں عابد سے مراد صوفی اور اس کی نشانی گلیم ھے۔ حکیم سنائی لکھتے ھیں :

ماہ ھا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش
صوفئے راخرقہ گردد یا حمائے را رسن

اس شعر سے بھی صوفی کے لباس صوف کی تائید ھوتی ھے۔ رسالہ قشیریہ میں تصوف پر اس طرح روشنی ڈالی گئی :

”رسول اللہ صلعم کے زمانے کے معاصر مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ پر فخر و افضل لقب صحابی کا ھوسکتا تھا، چنانچہ اسی لقب سے اس وقت کے افاضل موسوم ھوئے۔ اس کے بعد جب دوسری نسل پیدا ھوئی تو ان صحابین صحابہ کے لئے ’تابعین‘ کی اصطلاح چلی اور ان کی آنکھیں دیکھنے والے ’طبع تابعین‘ کہلائے۔ اس کے بعد جب امور دینی میں زیادہ غلوو انہماک ھوا، انہیں زھاد و عباد کہا جانے لگا۔ لیکن جب بدعتوں کا ظہور ھوا اور فرقے فرقے الگ ھوگئے تو ھر فرقہ مدعی بن بیٹھا کہ زھاد و عباد ان ھی میں ھیں۔ اس وقت اھل سنت کے طبقۂ خاص نے جو ذکر الٰہی میں مشغول اور غفلتوں سے دور رھتا تھا، اپنے لئے اھل تصوف کی اصطلاح قائم کی اور ھجرت کو ابھی دو صدیاں بھی نہیں ھوئی تھیں کہ یہ لقب طبقۂ خواص کے اکابر کےلئے مخصوص ھوگیا۔“

بعض مستشرقین کے متعلق بتایا جاچکا ھے کہ وہ صوف سے صوفی مشتق قرار دینے کے قائل ھیں۔ اب مشہور مستشرق مسٹر ڈی اولیری، برسٹل یونیورسٹی کی کتاب فلسفۂ اسلام (ص ۱۴۱) کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس میں قطعی طور پر یونانی کی تردید اور عربی کی تائید کی گئی :

”لفظ صوفی، صوف یعنی اون سے ماخوذ ھے اور اس طرح سے اس کے معنی اونی لباس پہنے ھوئے شخص کے ھیں۔ اس طرح سے لفظ صوفی کے معنی ایسے شخص کے ھوگئے جو سادہ سے سادہ قسم کا لباس اختیار کرتا ھے اور ھر قسم کے عیش و عشرت یا نمائش سے بچتا ھے۔ یہ امر کہ اس نقطے کے یہی معنی ھیں، اس واقعے سے بھی ثابت ھوتا ھے کہ ایرانی صوفی کےمعنی‌میں پشمینہ پوش کالفظ استعمال کرتا ھے۔ ایک عام غلطی کی بناپر بحث کرتے ھوئے اس لفظ کو لفظ صفا سے ماخوذ قراد دیتے ھیں۔ اور اس طرح سے اس کو پاک‌باز کے مماثل کردیتے ھیں۔ اس سے بھی زیادہ غلطی یہ ھے کہ بعض‌مغربی مصنفین اسے یونانی لفظ(Sophos)

سوفو بہ‌معنی ماہر کا ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک مغربی محقق کا بیان صوفی کی حقیقت کو واضح کر رہا ہے۔ مشرقی مصنفین میں سے بھی اکثر کی یہی رائے ہے۔ چنانچہ خواجہ عباداللہ اختر نے اپنی کتاب، علم تصوف (ص ۸۴)میں اس لفظ کے متعلق طویل بحث کی ہے :

''کہا جاتا ہے کہ لفظ 'صوفی' یونانی لفظ سوفسٹ (Sophist) سے مشتق ہے ... تاریخی واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت کے عہد مبارک میں جو مسلمان آنحضرت کی صحبت سے مستفیض ہوئے، صحابہ کہلائے۔ اس کے بعد جو صحابہ کو دیکھنے والے تھے' تابعین سے موسوم ہوئے، ان کے بعد جو تابعین کو جانتے پہچانتے تھے، تبع تابعین کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس کے بعد کوئی نام نہ رہا۔ علما، فقہا، واعظان وزہاد تھے۔ ان میں سے زہاد کا لباس صوف تھا ۔ اس لئے کہ آنحضرت بھی کمبل پوش تھے اور یہ لوگ حتی‌الوسع ظاہری حالت بھی بہ اتباع سنت رسول‌اللہ پسند کرتے تھے ... چونکہ یہ لوگ امن پسند، مرنجاں مرنج تھے اور اس کے ساتھ ہی زاہد و عابد بھی تھے خلوت گزیں ہوگئے۔ یہ لوگ صوف پوش تھے۔ ... علم‌الالسنہ کی رو سے بھی صوفی کو یونانی لفظ سوفسٹ سے ملانا درست نہیں ۔ جب یونانی فلسفے کی اشاعت مسلمانوں میں ہوئی تو وہ اس لفظ سے اچھی طرح واقف تھے...

سوفسطائی کہ از خرد بے خرداست
گوید عالم خیالی اندر گزراست

آرے عالم ہمیں خیال است ولے
جاوید در و حقیقی جلوہ گراست

(گویا) حکمائے اسلام اصلی یونانی لفظ سوفسطا سے خوب واقف تھے اور حسبانیہ سے بھی، اور ان کے عقائد کی تردید بھی کرتے تھے اس لئے صوفی اور تصوف کی اصل یونانی لفظ نہیں، اُن کو حسبانیہ اس واسطے کہا گیا ہے کہ یہ سب ریاضی داں تھے۔ سفسط کا منطقی اور لفظی صنعت پر فلسفہ ختم تھا۔''

اسی طرح ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی کتاب 'فکر اقبال' میں لفظ صوفی اور تصوف پر طویل بحث کی ہے۔ وہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ صوفی بہ‌معنی پشمینہ پوش ہے :

''اس کا آج تک کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوسکا کہ صوفی کا لفظ کہاں سے آیا۔ کسی نے اس کو صفا سے مشتق سمجھا اور کسی نے اصحاب صفہ سے اس کا جوڑ ملایا۔ کسی نے کہا یہ یونانی لفظ سوفی سے ماخوذ ہے ، جس کے معنی عرفان کے ہیں۔ لیکن اب مسلم اور غیر مسلم محققین زیادہ تر اس پر اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ یہ لفظ صوف سے مشتق ہے ۔ درویش، خدا سے لو لگانے والا اور تنعم دنیوی سے گریز کرنے والا زاہد ، رسول کریم کی طرح کملی والا ہوتا تھا۔ یہ

کملی عام طور پر صوف ہی کی ہوتی تھی جو ایک کھردری قسم کی اون کی بافت تھی۔''

بیانات بالا سے یہ امر بہ دلائل واضح ہوگیا کہ صوفی کا مادہ صوف ہے۔ لیکن اکثر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ لباس کے نام سے کسی گروہ یا فرقے کا منسوب ہوکر مشہور ہوجانا قرین قیاس نہیں ۔ گویا صوف سے صوفی بہ معنی پشمینہ پوش ایک فرقے کا نام نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ اعتراض کچھ وقیع نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے سامنے اس قبیل کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ''قزلباش'' صرف ایک قسم کی سرخ ٹوپی کی وجہ سے نام پڑا، اور آج جب کہ نہ وہ ٹوپی ہے اور نہ وہ لشکر و گروہ، مگر اس سے وابستگان قزلباش ہی کہلاتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک پلٹن کی وردی ''لال کرتی'' تھی۔ اسی سبب سے وہ پلٹن ہی ''لال کرتی'' کہلاتی تھی اور جہاں جہاں اس کی چھاؤنیاں بنیں، اس پلٹن کی قیام گاہوں کا نام، تا حال ''لال کرتی'' ہے۔ بڑی بڑی چھاؤنیوں میں اب تک اس نام کے محلے موجود ہیں۔ اسی طرح ایک پلٹن کی وردی ''گھاگھرا'' تھی اس کو ''گھاگھرا پلٹن'' کہتے تھے۔ احراریوں کو آج تک سرخ لباس کی وجہ سے ''سرخ پوش'' کہا جاتا ہے۔ انگریزی فوج کی وردی خاکی ہوتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے اور بعد میں بھی ''خاکی'' سے مراد فوجی سپاہی ہوتا تھا۔ غالب نے اس معنی میں کئی جگہ لفظ ''خاکی'' لکھا ہے:

''ارے اب اہل دہلی، ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔'' (خطوط غالب ص۲۹۲)

''پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا ۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے.... حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی ماردی۔'' (خطوط غالب ص۳۰۹)

سابقہ بیانات سے یہ امر بہ خوبی ثابت کیا جاچکا ہے کہ صوفی کا ماخذ صوف ہے، لیکن ہماری بحث ادھوری رہ جائے گی اگر ہم عام جائزہ لے کر، تصوف اور سوفسٹ کا فرق ظاہر نہ کردیں۔ درحقیقت یہ التباس اس وجہ سے پیدا ہوا کہ جب یونانی کتابوں کے ترجمے ہوئے تو اسلامی عقائد میں یونانی فلسفے نے دخل پانا شروع کردیا۔ یہ مامون الرشید (۱۹۸ تا ۲۱۸ ہجری) کا عہد تھا۔ مسلمان جو اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کے ذریعہ معرفت الٰہی کے قائل تھے، اب اصول دین کی تشریح و توضیح میں منطق و فلسفہ سے کام لینے لگے۔ یہ تحریک ارسطو کی الٰہیات اور

افلاطون کی مابعدالطبیعات کے ترجموں کی بدولت زیادہ ہوئی۔ الہیات کا ترجمہ ۲۲۶ھ اور مابعدالطبیعات کا ترجمہ ۲۶۳ھ میں ہوا۔ اس تحریک کا نام ''سوفسطا'' ہوا۔ سوفسط کے معنی مسلمانوں میں وقیع نہ تھے، بلکہ سوفسطا، سوفسطائی اور سوفسطائیت کے معنی، غلط حکمت کج بحث کرنیوالا، غلط استدلال کرنے والا اور دھوکے بازی قرار دیے۔ انگریزی میں بھی سوفسٹ کے یہی معنی ہیں۔ چنانچہ اس غلط رو اور تعقل فی‌الاسلام کو علما اور زہاد نے گمراہ کن خیال کیا۔ ابتدا میں تو انہوں نے اسلام کے سادہ اور سیدھے اصولوں کے مطابق یونانی فلسفے کی تردید کی، لیکن جب بحثوں نے طول پکڑا اور لوگوں کو منطق و فلسفے کا دلدادہ پایا تو بہ‌مصداق ''لوہے کو لوہا کاٹتا ہے'' ان علما نے یونانی منطق و فلسفہ ہی کو مدافعانہ طور پر استعمال کرنا شروع کردیا اور اسی حربے سے یونانی افکار و آراء کی تردید کرنے لگے اور کامیاب ہوئے۔ یہ ''علم‌الکلام'' کہلایا۔ اور اسی طرح مسلمانوں میں وہ علما جو فلسفہ یونانی کی تردید کرتے تھے، انہیں حکیم اور متکلم کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ یونانی فلسفے کے ماہر اور اس کے بطلان پر قادر ہوتے تھے۔ اور اسلامی عقاید واصول دین کو بہ‌دلائل عقلیہ ثابت کرتے تھے، یہی علم معرفت ہے۔ دوسرا گروہ صوفیوں کا تھا جو توحید و ذات و صفات باری‌تعالیٰ کی معرفت، کشف و حال کے ذریعے کرتے تھے۔ انہوں نے بھی جب اپنے کشف و حال کی کیفیات کی توضیح و تشریح قلم‌بند کی، اور تصوف کو ایک علمی حیثیت حاصل ہوئی تو کچھ اصطلاحات علم کلام کی بھی داخل ہوگئیں۔ ان دونوں گروہوں کا فرق، اس روایت سے واضح ہو جائے گا کہ جب بوعلی‌سینا اور ابوسعید ابوالخیر کی ملاقات ہوئی، ایک ہفتے تک دونوں گفتگو کرتے رہے۔ جب دونوں رخصت ہوئے تو بعد میں دونوں کے وابستگان نے ایک دوسرے کے متعلق پوچھا۔ بوعلی‌سینا نے کہا، جو کچھ میں جانتا ہوں، یہ دیکھتے ہیں۔ ابوسعیدابوالخیر نے کہا جو کچھ میں دیکھتا ہوں، یہ جانتے ہیں۔ حکیم کو علم بہ‌ذریعہ عقل ہوتا ہے اور صوفی کو علم بہ‌ذریعہ کشف۔

اس لئے صوفی کی معرفت و علم کا تعلق بھی یونانی فلسفے سے نہیں ہے۔ لہذا صوفی، لفظاً و معناً یونانی نہیں، بلکہ صوف بہ معنی اون سے مشتق ہے اور اس کے عقائد اسلام سے منسوب و متعلق۔ البتہ‌بعد میں اسلامی تصوف کا دیگر اقوام کے خیالات سے متاثر ہونا مستبعد نہیں ہے۔

احسن اللہ خاں بیاںؔ

سخاوت مرزا

خواجہ احسن اللہ خاں تخلص بیان، تلمیذ مرزا مظہر جان جاناں رح کے حالات اکثر تذکروں میں موجود ہیں۔ ہم یہاں تذکرۂ شعرائے اردو، (ترجمہ اسپرنگر کیٹ لاگ) سے کچھ حالات نقل کرتے ہیں جو اکثر تذکروں کا خلاصہ ہے:

"بیان، خواجہ احسن اللہ، ساکن آگرہ و شاگرد مرزا مظہر (تذکرہ جات قایم، گردیزی و شورش)۔ یہ دہلی میں رہتے تھے اور ایک دیوان چھوڑ گئے (تذکرۂ علی ابراہیم)۔ کچھ عرصہ ہوا یہ دکن چلے گئے اور وہاں ایک عہدے پر مامور ہیں (تذکرۂ مصحفی و گلشن ہند)۔ ذکا اور قاسم، اور صاحب طبقات سخن کے خیال میں ان کا نام احسن الدین خاں ہے۔

اصل میں یہ کشمیری تھے، مگر دہلی میں پیدا ہوئے۔ اب حیدرآباد میں ایک عہدے پر مامور ہیں۔ انہوں نے ایک مثنوی 'جنگ نامہ' کے نام سے لکھی ہے۔ (تذکرۂ ذکا)۔ ۔ ۔ یہ قاسم کے شاگرد تھے جو ان کی مثنوی کو 'چپک نامہ' کہتے ہیں۔"

صاحب مخزن نکات اس طرح رقم طراز ہیں:

"خواجہ احسن اللہ المتخلص بہ بیان، ہنگامہ آرائے صحبت اشعار است، درفن قدیمی دست مایہ دارد، پیش ازیں کوکے خاں فغاں(۱) در دہلی بود، بنابر علاقۂ محبت باوسی گزارند، دریں ایام بیکار است، او تعالیٰ در خور مراد جمعیت ظاہری و باطنی کرامتش کناد، بیت

کس واسطے شتابی جانے کی اس قدر ہے
گو صبح ہوئی، پیارے یہ بھی تو اپنا گھر ہے

(صفحہ ۴۷ مطبوعہ)

مولف گلشن بیخار فرماتے ہیں:

"خواجہ احسن اللہ دہلوی نژاد است از تلامذۂ مرزا جان جاناں مظہر علیہ الرحمہ اکبر بودہ بیعت طریقت بخدمت مولانا فخرالدین قدس سرہ نمود، آخرالامر بہ حیدرآباد رفتہ وازاں جا راہی عدم آباد گشت، حدیثش شیریں

---

(۱) کوکے خاں فغاں (مرزا اشرف علی خاں) پنج ہزاری منصبدار تھے، بنگال گئے اور وہیں کے ہو رہے — بیت: نہ اے قاصد میں رو رو یار کو فریاد کرتا ہوں
ترا منہ دیکھ کر اپنے لکھے کو یاد کرتا ہوں
(مخزن نکات۔ صفحہ ۴۲، مطبوعہ)

دیوان فغاں انجمن ترقی اردو پاکستان سے شایع ہو چکا ہے۔ بیان نے اپنے یار غار فغاں کا ذکر اس طرح کیا ہے:

اس غزل پر گر فغاں الجھے تو پھر ہو یوں بیان
میں تو اس لائق نہیں یہ لطف فرماتے ہو تم (دیوان بیان قلمی، کتب خانہ آصفیہ)

و دلاویز ، نمکین و شور انگیز ازشیوا بیانی اوست :
قفس میں ، میں رهائی کے لئے کیا کیا نہیں کرتا
تڑپتا ہوں پھڑکتا ہوں ، کوئی پرواہ نہیں کرتا

لچھمی نارائن شفیق او رنگ آبادی رقم طراز ہے :

"خواجہ احسن اللہ بیان از و جاہت صوری و حسن سیرت بہرۂ وافی داشتہ بود ، از معنی طرازی مزاج والا یش علمِ اندیشۂ آسمان پیمامی داشت ، مولدش خاک پاک اکبر آباد است ، و بہ موزون مزاجی میرزا مظہر جان جاناں استاد مرتبۂ حسن خلقش در حوطۂ بیان نمی آید ، و داؤد کلکش چنین ترانۂ نشاط می سراید ، این اشعار از ہر دو تذکرہ می یابد :

بندے سے ثنا حضرت استاد کی کیا ہو
مظہر ہے خداوند کی وو شان رقم کاالخ"

(چمنستان ، ورق ۲۰۵۔ مخطوطہ آصفیہ)

تذکرۂ ہندی گویان مصحفی ، تالیف (۱۲۰۱ھ) میں لکھا ہے کہ "بیان ، خواجہ احسن الدین خاں ، شاعر مربوط گو و صاحب زبان است ، مدتے گذشتہ کہ بہ طرف دکن رفتہ ، گویند کہ در سرکار نظام علی خاں عز و امتیاز دارد ۔ فقیر ہنوز او را ندیدہ ... انتخاب دیوان اوست ۔"

(ص ۳٦ پر ۲۲ اشعار دیے ہیں)

ایک مضمون مولوی ڈاکٹر عبدالحق مدیر رسالۂ اردو کا ، رسالۂ اردوئے معلیٰ علی گڑھ ۱۹۰۵ع میں جب کہ حسرت موہانی ایڈیٹر تھے ، چھپا تھا اور انتخاب دواوین شعرائے اردو ، مرتبۂ حسرت موہانی میں بھی ان کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے ۔ اور "طراز عشق" مولفۂ نواب سید نورالحسن خاں (بھوپال) مطبوعہ مفید عام آگرہ میں بھی بیان کے کلام کا انتخاب چھپ چکا ہے جس کا ایک ابتدائی شعر یہ ہے :

جس کسی نے دل دیا اون کو چھپے چوری دیا
ایک میں کمبخت ناداں تھا کہ رسوا ہو گیا

مگر بیان کے شاگرد گلاب چند ہمدم اپنے دیوان کے دیباچے میں اپنے استاد کے متعلق اس طرح زمزمہ پرداز ہیں :

"درین روزگار فیض آثار ذات با برکات رونق افزائے بزم سخنوری و زیب بخشائے انجمن ہنر پروری سر آمد سخن آران جہان استاد زمان احسن الدین خاں بہادر کہ بیان نے نظیر و بے عدیل کہ صیت بلند سخنوری اودر اکناف و اطراف جہان رسیدہ ، و شہرۂ عالی فہمی او از دکن تا باصفہان غلغلہ تمام افگندہ ، زہے تقدس صفات کہ اشعۂ اشعار آبدارش بر شعاع پر ضیائے مہر منیر تفوق ، حسبۂ و نغمۂ سخنان بلند مقدارش ابواب نور پاشی بروئے ماہ منور بستہ ، قیاس ازفیض بخشی کلامش از حال من ناتوان ، توان گرفت ۔ از روزے این اضعف العباد خالق ذوالکرم مسمی بہ رائے گلاب چند ہمدم بہ ولولۂ شوق سخن پردازی ، باستنباط انوار فیوضات آن صدر

نشین محفل دانشوری، کامیاب گردیدہ،
بجلوہ افروزی آفتاب عنایتش ذرہ کلام
این بضاعت بسان اختر درخشان وبابصار
خورشید رخشان عامش سنگریزہ مصنفہ
این ناقص فطرت کہ رشک افزائے لعل
بدخشان است، الخ،،

نیز ہمدم نے ایک طویل قصیدہ بھی اپنے استاد کی تعریف میں لکھا تھا جس کے کچھ اشعار درج ذیل ھیں :

عنوان ،، در مدح استاد ،،

خواب سے یک بارجوں ھی آنکھ کھل گئی صبح کو
یہ خیال آیا کہ لکھ اک قصیدہ آج تو(؟)
طبع کے توسن کی اپنے ٹک اٹھالے تو عنان
شعر کے میدان میں تا آکر پھرے وہ تند خو
پھر میں حیران ہوں کہ لکھے گا تو کس کی مدح میں
بادشاہ تک ھیں گدا دنیا میں تیرے رو برو
شکوہ گردون دون پرور تجھے تب ہے روا
جب کہ کچھ دل میں رکھے ہے طمع کی تو آرزو
سوتو کس سے غرض رکھتا ہے نے مطلب نہ کام(؟)
کچھ کسی بھی طرح کی تجھ کو نہیں ہے جستجو
ہے مگر انسان کو لابد کہ ہو فکر معاش
سو خدا ھر طرح سے پہنچائے ہے اک نان جو
شکر کے عہدے سے اس کے میں نکل سکتا نہیں
بال باندھا اس کا ھزتن کا میرے ھر ایک مو(؟)
پھر کسی کی وصف میں کیوں کیجیے اوقات صرف
صاحب ہمت نہ لیویں منت دو نان کبھو
....
لکھ ثنا گر چاھتا ہے حضرت استاد کی
تا ترے دل کی نہ دل ھی میں رہے یہ آرزو
کون یعنی احسن الدین خان بہادر کی جناب
ہے بیان جس کا تخلص فخر دے جو شعر کو
....
بے نظیر دھر ، عالی طبع ، والا منزلت
نکتہ سنجان جہان کو ہے اسی سے آبرو
گو بظاھر صورت انسان ہے وہ عالی جناب
لیک باطن میں ملک سیرت ھی ہے وہ ھو بہو
نام کو تلخی نہیں رکھتا ہے وہ شیریں زبان
آیہ رحمت ہے وہ، وھاں دخل کیا ہے قہر کو
کچھ رکھے ہے خلق وہ رنگین مزاج اس رنگ سے
یہ لطافت کیا ہے کوئی گل میں اور یہ رنگ و بو
وصف، اور اوصاف اوس کے کسطرح سے میں لکھوں
ہووے کیا مجھ سے بیاں جیسی کہ وہ رکھتا ہے خو
کہہ اٹھیں بے شک یہ سن کر انس سے بے تا ملک
جا کے پڑھ ایسا ھی مطلع ایک اوس کے روبرو
مطلع اول :

و صف تیرا کیا کہوں اے شمع بزم گفتگو
سب پہ روشن ہے، نہیں تجھسا کوئی، ہے توھی تو
اصفہان سے تا بہ ھند اور ھند سے لے تا دکن
اب تلک ایسا ھوا ہے کوئی نے ھوگا کبھو
مجھ سے ذرہ کو کیا جوں مہر جس کے فیض نے
پوچھنا کیا ہے پھر اسکی روشنی طبع کو
اے مسیح وقت تیری ذات ہے وہ دھر میں
مردہ دل بھی زندہ ھو یک بار تیرے روبرو
خضر اب اسکو لکھوں یا چشمہ آب حیات
مدح میں دل سے لکھا اب اک مطلع رنگیں اور تو
مطلع ثانی :

آئینہ حیران ھووے سن کے تیری گفتگو
سبز ھوسکتی ہے طوطی کوئی تیرے روبرو

اس قدر سرسبز کرتا ہے زمین شعر وہ
عمر بھر جانے نہ سبزی یہ زمرد سے کبھو
شعر رنگیں سے کچھ اسکے اس قدر ٹپکے ہے رنگ
جس کی رنگینی کے آگے لعل کب ہو سرخ رو
تب کروں میں وصف اس کی آبداری کا بیان
آب گوہر سے زباں کو پہلے دے یوں شست و شو
....
یہ تو منہ رکھتا ہے اے غافل کہ تو اور اس کی مدح
دور تھی یہ بات تو تیری سمجھ کے روبرو
....
جب تلک قایم رہے یا رب زمین و آسماں
جب تلک رکھے جہاں میں خلقت آدم کو تو
مہر و مہ سے جب تلک روشن ہو قندیل فلک
یا الٰہی تب تلک رکھیو وہ شمع بزم کو
دود ماں شعر کا ہے اک وہی چشم و چراغ
تا ابد رہیو وہ روشن بس یہی ہے آرزو

ہم یہاں بیان کی داخلی شہادتوں سے ان کے مزید حالات پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں ۔

بیان کس خدمت پر مامور تھے صاف طور پر پتہ نہیں چلتا ۔ قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاہی فوج کے ساتھ رہا کرتے تھے ۔ اور مرہٹوں کے معرکے میں نواب ارسطو جاہ کے ساتھ پونا بھی گئے تھے ۔ چنانچہ ایک رباعی میں مرہٹوں اور محاصل چوتھ کا ذکر کیا ہے ۔ ان کے شاگرد ہمدم نے اپنے کلام کی ترتیب اور نظرثانی کے ضمن میں ایک یہ فقرہ لکھا ہے :

''آغاز این گلدستۂ گلستان سخنوری در ایام رونق افزائے معسکر فیروزی بہ بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد بوقوع آمدہ ۔ اگرچہ آرزوئے دلی و تمنائے قلبی این نیازمند ازلی ہمگی درین بود که این نسخۂ موزون بحیات آن خان موصوف مرتب باتمام شدہ از نظر والا شان مجلی و مزین می گشت لا کن ہنوز این مجموعۂ اشعار حسن ترتیب نیافتہ بود کہ دیباچۂ عمر آن سر آمد فضلائے روزگار برختم رسید غفر اللہ تعالیٰ عنہ''۔

جس سے پتہ چلتا ہے کہ بیان بھی شیر محمد خاں ایمان، اور محمد صدیق قیس کی طرح شاید وقایع نگاری کے افسر کی حیثیت سے مامور تھے ، اور لفظ ''بہادر'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بہادری کا خطاب بھی دربار آصفجاہی سے عطا ہوا تھا ، ان کا اصلی نام احسن اللہ خاں اور خطاب ''احسن الدین خاں بہادر'' ہوگا ۔ مصحفی نے اپنے تذکرے میں ان کا نام احسن الدین خاں لکھا ہے ۔ (تذکرۂ ہندی گویان) ۔ بیان ایک صوفی منش اور متوکل علی اللہ تھے ، ان کو جاگیر اور معاش کی کوئی فکر نہ تھی بلکہ ایک سچے قدردان کے متلاشی تھے ۔ چنانچہ ارسطو جاہ کے پاس ان کی رسائی ہو گئی جن کو وہ اپنا قدر شناس سمجھتے تھے ۔ اور اس کو نعمت غیر مترقبہ جانتے تھے ۔ چنانچہ ارسطو جاہ کے قصیدے میں لکھتے ہیں :

اگر ہزار برس تک بیاں کروں تقریر
تو ہو سکے نہ ادا مجھ سے شکر حی قدیر
مرے تو دل میں تلاش معاش اوتنی نہیں
کہ جس کے واسطے اتنا فلک کرے تشہیر
نہ چاہوں اوس سے کبھو میں عروج منصب کا
نہ حرص زر کی رکھوں ہوں نہ خواہش جاگیر
جسے ہو کنج قناعت میں خشک نان کافی
بخر بند کبھی نہ جاویں کبھیں پیاز و پنیر

ملا ہو لطف جسے بوریا نشینی کا
وہ پشم سمجھے ہے قالین کو اک بچھا کے حصیر
مگر تلاش تھی دل میں تو شخص کامل کی
وہ خواہ امیر بظاہر ہو، خواہ ہووے فقیر
سو ایسی دولت جاوید یاں دکھن میں ملی
کہ ایک شخص کہ پایا ہے بے عدیل و نظیر الخ

غلام سیدخاں المخاطب بہ ارسطوجاہ ۱۱۹۰ھ میں خدمت دیوانی سے سرفراز ہوئے تھے۔ اور اس سے قبل اورنگ آباد کے قلعدار تھے۔

(بستان آصفیہ ص ۱۳۸)

ان کے معاصر میر عبدالحی تاباں نے ایک شعر میں بعض شعرائے معاصرین کے ضمن میں بیان کی شاعری کے متعلق بھی اشارہ کیا ہے۔

نواب آصفجاہ ثانی (۱۱۷۵ھ تا ۱۲۱۸ھ) کی شان میں بیان نے ایک مستزاد رباعی کہی تھی جس کا عنوان ہے ''در مبارکبادی حضور پرنور کہ ۱۲۱۰ھ واقع شدہ''

مستزاد رباعی

از خضر زیادہ تو معمر باشی با دولت و جاہ
در حفظ و حمایت پیمبر باشی اے خلق پناہ
مادام کہ آفتاب محشر تابد با عمر دراز
تو بر سر خلق سایہ گستر باشی انشاءاللہ

بعض تاریخی واقعات :

مسدس (۶ بند) در مدح نواب آصفجاہ نظام الملک نظام علی خاں رستم دوراں
(متوفی ۱۲۱۸ھ)

یا الٰہی تا قیامت فتح و نصرت ہم رکاب
اس در دولت کے بد اندیش کا خانہ خراب
آتش دوزخ میں ہو بدخواہ کا سینہ کباب
خیر خواہوں کی دعا کیسی ہوئی یہ مستجاب
شاہ عالم نے دیا تھا رستم دوراں خطاب
سو خدا نے کر دکھایا راست اے عالیجناب

شاہ عالم سے مراد شاہ عالم ثانی (احمدشاہ، ۱۱۷۳ھ تا ۱۲۱۹ھ) ہے۔ یہ وہی مغل مظلوم بادشاہ ہے جس کی آنکھیں غلام قادر روہیلہ نے نکال لی تھیں۔ میر نظام علی خاں بڑے بہادر تھے، سن شعور سے لے کر آخر عمر تک نبردآزمائیوں میں گزری۔ ٹیپو سلطان، مرہٹے، ان کے مدمقابل تھے۔ ان کی بہادری کی شہرت ہندوستان تو کیا یورپ تک پہنچ گئی تھی۔ اور شاہ عالم ثانی نے رستم دوراں کا خطاب دیا تھا۔ بیان نے ان کی شان میں ایک دعائیہ مخمس لکھا تھا جس کا عنوان یہ ہے :

''دعائیہ حضور پرنور فی السنہ یکہزار و دو صد و دہ ہجری در ایام ... شدہ، رفتن عالیجاہ بہ اورنگ آباد۔''

ان کے صاحبزادے عالیجاہ نے بغاوت کی تھی، اور بعد بغاوت ۱۲۰۹ھ میں وفات پائی۔ اور نظام علی خاں اورنگ آباد چلے گئے تھے۔

دعائیہ :

مخالف ہمیشہ ترا خوار رہیو
مرض سے شفاعت (شقاوت؟) کے بیمار رہیو
سزائے عمل میں گرفتار رہیو
چمن تیری دولت کا بے خار رہیو
یہ مسند تجھی کو سزاوار رہیو

دوسرا عنوان ہے ''واپسی ارسطوجاہ از پونا،،

یہ واقعہ ۱۲۱۲ھ کا ہے جب کہ ارسطو جاہ ۱۲۱۰ھ میں مرہٹوں اور نظام کے مابین عہد نامہ کی رو سے بطور کفالت پونا بھیجے گئے تھے ۔ ۱۲۱۲ھ میں حیدرآباد واپس ہوئے اور ۱۲۱۹ھ میں وفات پائی ۔ (صفحہ ۱۳۹ بستان آصفیہ)

وزیر اعظم بخیر و خوبی بدولت و جاہ آج آیا
ہزار شکر اور کڑوڑا احسان خدا نے یہ دن ہمیں دکھایا

اب چوتھ کا کیا ذکر کہ لیں نام مرہٹے
تدبیر عجب اعظم الامرا سے بن آئی
از روئے یقیں مجھ کو بیاں ہے یہ بشارت
پونہ میں ہوئی رستم دوران کی دہائی

بیان نے ایک چوہے نامہ بھی لکھا تھا جس کا عنوان یہ ہے :

''موش نامہ (چوہے نامہ) کہ در سال خوک در پانکل گفتہ شدہ ۔''

پانکل جنوبی ہند کا مشہور قلعہ ہے جہاں آصفجاہ ثانی ۱۲۰۳ھ میں بہت بڑی فوج کے ساتھ گئے تھے اور وہاں سے نواب سکندر جاہ ولی عہد کو سرپرنگ پٹن پر حملے کے لیے روانہ کیا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر احسن اللہ خاں بیان بھی ہمراہ تھے اور یہ چوہے نامہ وہاں لکھا تھا ، جہاں چوہے وغیرہ کثرت سے تھے ۔

(بستان آصفیہ' صفحہ ، ۵۸)

حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی وفات کی اکثر لوگوں نے تاریخیں کہی تھیں مثلاً قمرالدین منت نے کہا :

''عاش حمیداً مات شہیداً''۔ اور مرزا سودا فرماتے ہیں :

تاریخ از روئے درد ، یہ سن کے کہی
سودا نے کہ ہائے جان جاناں مظلوم

اپنے استاد کی وفات پر ، بیان کی حسب ذیل رباعی، قابل داد ہے :

صہبا شد خوشہ کہ در خم جو شید
درہا شد قطرہ کہ در بحر رسید
چوں دار بقا جناب مظہر بگزید
تاریخ وصال ''مظہر کل'' گردید
۱۱۹۵ھ

صوفیانہ نقطۂ نظر سے ''مظہر کل'' اچھا مادہ ہے ۔ یعنی قطرہ دریا ہو گیا ۔

بقول مولوی عبدالحق مرحوم، بیان نے اپنی ایک رباعی میں عالمگیر کے خضاب لگانے کے متعلق ایک تلمیح پیش کی ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ عالمگیر اول تو ۱۱۱۷ھ میں وفات پا چکا تھا اور اس وقت بیان تو پیدا بھی نہیں ہوئے ہوں گے ۔ دراصل معلوم یہ ہوتا ہے کہ بیان نے عالمگیر ثانی (۱۱۶۷ تا ۱۱۷۳ھ) ابن جہاندار شاہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو اردو کا شاعر بھی تھا اور بیان اس زمانے میں دہلی میں مقیم تھے ۔ اور یہی زمانہ ان کا اپنے مرشد طریقت مولانا فخر الدین دہلوی رح (وفات ۱۱۹۹ھ) سے فیض حاصل کرنے کا ہے ۔ قراین یہ ہیں کہ بیان ، عالمگیر ثانی کے قتل (۱۱۷۳ھ) کے بعد دکن آگئے ۔ اس وقت دکن میں آصفجاہ ثانی میر نظام علی خاں (۱۱۷۳ھ تا ۱۲۱۸ھ) حکمران تھے ۔ چنانچہ بیان نے نظام علی خان مذکور کی مدح میں قصاید بھی کہے ہیں۔

جس کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے جب کہ وہ باریاب ہوچکے تھے۔ غرض بیان چالیس سال سے زیاد دکن میں رہے اور یہیں ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی۔ مادۂ تاریخ وفات مستخرجہ گلاب چند ہمدم سے ۱۲۱۳ھ بر آمد ہوتے ہیں۔ قطعۂ وفات یہ ہے :

ماہ صفر بہ جمعہ از دھر چوں بیاں رفت
صد نالہ از تہ دل تا اوج آسماں رفت
تاریخ رحلت او ہمدم چو جستم از دل
نالید و گفت ہاتف، استاد از جہاں رفت
۱۲۱۳ھ

بیان کو حضرت مرزا جان جاناں مظہر سے تلمذ تھا جس کے اشارے ان کے دیوان میں بھی موجود ہیں۔ اپنے خواجہ تاش یقین کی غزل پر ایک مخمس میں اپنی شاگردی کا بڑے مزے سے اس طرح ذکر کرتے ہیں :

مظہر کی بندگی میں ہے اب بیان بھی حاضر
وہ خوب جانتا ہے جتنے ہیں آپ شاعر
یہ اپنے حق میں صاحب کرتے ہیں عیب ظاہر
حق کے یقیں کو، یارو برباد مت دو آخر
تم نے سخن کی طرزیں اوس سے اوڑائیاں ہیں

مخمس تضمین از شفیق (صاحب) تخلص اورنگ آبادی بر غزل بیان :

کیا سمجھے، لعل کان میں نکلے
یا دفینہ مکان میں نکلے
یہی بس اب گمان میں نکلے
کوئی ایسا جہان میں نکلے
کہ درست امتحان میں نکلے

عرض کرتا ہے صاحب مسکیں
طبع تیری ہے سر بسر، رنگیں
نظم تیری ہے خوشہ، پرویں
اے بیان تیرے ریختہ کی زمیں
نہ زمین آسمان میں نکلے

(رسالہ مکتبہ ۱۹۲۹ھ جلد ۲۔ ص ۲۵ مضمون شفیق اورنگ آبادی از عمر یافعی)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے نسخے میں بعض غزلیں وغیرہ موجود نہیں ہیں۔

کتب خانہ، آصفیہ کا نسخہ قدیم ہے جو شاعر کے زمانہ، حیات کا مکتوبہ ہے۔ جس کی کتابت ۱۲۰۰ھ میں ہوئی ہے۔ اس میں (۳۰۴) غزلیات، (۳۰) رباعیات، (۴) مخمس، ایک مختصر مثنوی درتعریف چاہ مومن خان، ۲۳ ابیات کی اور دوسری درجواب ایراد ۱۰۱ ابیات پر مشتمل ہے۔ جس میں وہ میر سجاد تلمیذ آبرو کو قبلہ شعرا اور شہر استاد مانتے ہیں جنہوں نے بیان کی طرف سے اونکے کلام کے نکتہ چینوں کو دنداں شکن جواب دیا تھا۔ خصوصاً اس پر کہ ''آسمان ایک خط استوا ہے''۔ یعنی یہ کہ بیان کو آسمان کے وجود سے انکار ہے، لعن طعن کی تھی تو بیان نے نیز سجاد نے خاقانی کی یہ سند پیش کی :

لفظ بوئے سر بمہر آمد بہ ما
اس میں وہ بولا ہے خط استوا

یہ ایک ورق اسوخت (۴صفحات)، قصیدہ در منقبت حضرت علی رض (۱۴ بیت)۔

کتب خانہ، سالار جنگ کا نسخہ مکمل

اور خوش‌خط ہے مگر اس میں بھی بعض نظمیں نہیں ہیں مثلاً 'ہجو مرزا فیضو' اور اس کا سنہ کتابت ۱۲۸ھ قرار دیا ہے جو در اصل مشکوک ہے۔ مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب نے اس کا سنہ کتابت ۱۲۰۸ھ قرار دیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ صفحہ اول اور آخر پر سید محمد علی خان بہادر کی مستطیل مہر ثبت ہے جس پر ۱۲۲۱ھ کندہ ہے۔ نیز یہ کہ جب اس دیوان میں بعض قطعات تاریخی ۱۲۱۰ھ کے درج ہیں تو ۱۲۰۸ھ سنہ کتابت صحیح نہیں ہو سکتا۔ دیوان کے سر ورق پر ان کا نام اس طرح لکھا ہے :

''دیوان احسن‌الدین خان بہادر تخلص بیان'' جو مرزا سلطان‌المخاطب بہ سلطان مرزا خان بہادر حیات‌الدولہ کی ملک میں رہ چکا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا سنہ کتابت ۱۲۱۸ھ ہو اور ۱۲۲۱ھ میں نواب حیات‌الدولہ کے ہاتھ آیا ہو۔

انتخاب کلام بیان :

مطلع

کیا کیجیے بیان اوس کے وجود اور قدم کا
طاقت نہ زباں کی ہے نہ مقدور قلم کا

بیان تیرے کوچے سے چلتا رہیگا
مری جان تو ہات ملتا رہیگا
نہیں اشک آنکھوں میں تھمتا کہاں تک
یہ لڑکا پنگھوڑے میں پلتا رہیگا
ہمارا ہے سینہ کہ آتشکدہ ہے
الٰہی کہاں تک یہ جلتا رہیگا
گریں گے نہ کیونکر ان آنکھوں سے موتی
یہی در اگر تو اگلتا رہیگا
بیان ، کیا کروں ترکتازی میں اوس کی
ادھر جب تلک تو سنبھلتا رہیگا

پھنستے دیکھے اس میں پارساؤں کے بھی پاؤں
ہے بچھا بے طرح کا ، یہ اے مغاں دام شراب
مست اپنے کام میں ہشیار دیکھے اے بیان
ہات سے دیتے نہیں اعزاز و اکرام شراب

کیا آگ لگ رہی ہے سینے میں کس سے کہیے
اے چشم اشکباری، جو اب نہیں توپھر کب

دل نہیں عاشق تو ٹھنڈی سانس یہ بھرتا ہے کیا
مونہہ کو اس کے دیکھتا اور چشم، ترکرتا ہے کیا
روئیے دل کھول کر شاید کہ رحم آوے او سے
جب ہوئے عاشق تو رسوائی سے پھر ڈرتا ہے کیا

نکلے ہے لالہ خاک کے نیچے سے سرخ سرخ
رنگیں ہوا شہیدوں کے خوں میں بہا بہا

مرزا غالب نے اسی مضمون کو اس طرح کھپایا تھا :

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اشک یوں تھم رہیں ہیں مژگاں پر
کوئی موتی پرو نہیں سکتا
شب مرا شور گریہ سن کے کہا
میں تو اس غل سے سو نہیں سکتا

دل شکستہ ہوں میری ہو کیا قدر
کام آتا نہیں گہر ٹوٹا

مذکور جب آیا رخصت کا
دل سن کر تو سن مار رہا
پر آنکھوں نے طوفان کیا
وہ پار ہوا میں وار رہا

بیان کا حسب ذیل شعر ضرب المثل ہو گیا ہے:

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا
سرخ و سفید ماٹی کی مورت ہوئی تو کیا

نادر تشبیہ:

دو مونہہ کھلے انار ہیں اے چشم خوں فشاں
آخر یہ دوستی نے تمہارے ثمر دیا

یہ حساب دوستاں در دل مثل مشہور ہے
پرعجب ہیں دوست جو دل میں بھی کرتے ہیں حساب

کیا قیامت زہر قاتل ہے تری ساقی شراب
صبح محشر سے ورے ہوتے نہیں بیدار مست

جدت پسندی:

سوجگہ لغزش کریں اور پائے خم میں جا گریں
کام میں اپنے جو ہیں تو ہیں (وہی؟) ہشیار مست

جم جس کے پاس ہے وہ فلاطوں سے کم نہیں
جمشید ہے وہ جس کو میسر ہے جام آج

میٹھی باتیں کدھر گئیں پیاری
اب تو ہر بات کا جواب ہے تلخ
سات دینا یہ بوسہ و دشنام
قند شیریں ہے اور گلاب ہے تلخ

حسن تعلیل:

عکس میرے دل کے داغوں کا ہے اس آئینہ میں
آسماں لایا کہاں سے ورنہ تارے اس قدر
تھا گسستہ کوئی دیوانہ سو اب ہے جاں بہ لب
اس کے کوچے میں کوئی جا کر پکارے اس قدر

روز مرہ:

محفل میں اس کی جا کر اشعار عاشقانہ
پڑھتے تھے قابلیت اپنی جتا جتا کر
وہ تند خو یہ بولا کوئی کہے بیاں سے
تو شعر مت پڑھا کر مجھ کو سنا سنا کر
میں پیار کی نگہ سے مرتا ہوں مجھ کو ظالم
کرتا ہے قتل ناحق تیوری چڑھا چڑھا کر
اب ذکر اوسکے لب کا آیا مری زباں پر
دل چاہتا ہے کیجے باتیں چبا چبا کر

اے مسیحا مجھ کو تو زندہ نہ کر
اون لبوں کے منہ سے شرمندہ نہ کر

نہ برسوں میں پوچھے تغافل کے صدقے
سدا نام بھولے تجاہل کے صدقے
جلو میں کھڑے ہیں پریزاد لڑ کے
دوانے ترے اس تجمل کے صدقے

مرے نامہ کے ہے از بسکہ رو اور پشت میں آتش
مثال مشعل آوے نامہ بر کے مشت میں آتش
نہ پوچھو داغ دل کتنے ہیں اور ہے کسقدر سوزش
لگی کتنی ہی کتنی میری ہر انگشت میں آتش

هزار آتشکدے سینے میں، میں نے داب رکھے ہیں
کلیم آسا یہاں پھرتا، دکھاتا مشت میں آتش
بیان کا خط کھلا یا چادر آتشباز نے چھوڑی
بھری تھی بسکہ سوز دل سے رو اور پشت میں آتش

مضمون خط :

پہلے جواب صاف تمہیں دیدئے گئے
جو بندگی کا دیتے تھے لکھ کر مدام خط
یہ کس کو میں لکھوں ہوں کہ خوں ناب چشم سے
رنگیں ہے جیسے کاغذ ابری تمام خط
لکھتا ہوں سر گزشت شب ہجر میں بیاں
ہو گا نہ روز حشر تلک اختتام خط

بے جراتی پہ دال ہے گر کیجئے یہاں لحاظ
اب وصل ہے، کدھر کا ادب اور کہاں لحاظ
کیا مونہہ ہے، سوال بوسہ کوئی اس سے کرسکے
وہ جس کا نام لینے، کرے ہے زباں لحاظ

جدت مضامین :

جوں پتنگوں کے جلانے کا سبب ہوتی ہے شمع
توانہوں کے غم میں رو رو جان بھی کھوتی ہے شمع
یہ سر شک آتشیں کیا ہے سمجھتا ہے کوئی
دل میں پروانوں کے تخم دوستی بوتی ہے شمع
یہ جو پروانے کو مارا کوئی بیٹھا ہے کلنک
روسیاھی اپنی اب رورو عبث دھوتی ہے شمع
مرگ سے غافل نہیں جو شخص ہیں روشن ضمیر
صبح کے ڈر سے بیاں شب کو نہیں سوتی ہے شمع

ہووے گا ذوق حسرت دیدار میں خلل
شیریں گذر نہ کیجیو فرہاد کی طرف

بظاہر تو عاشق ہی ہوتے ہیں قربان
بہ باطن ہیں معشوق، قربان عاشق
مقابل ہی رہتا ہے ہر وقت تیرے
ہے آئینہ یا چشم حیران عاشق

بعد مدت کے ہم آغوش ہوا ہوں ظالم
آہ اس وقت نہ تو اپنے تئیں خواب میں ڈال
اے مہوس تجھے اکسیر بنانا ہے یہاں
خاک اس کوچے کی لے اور اسے سیماب میں ڈال

گرہ تو اور بھی دنیا میں ہیں کئی محکم
عجب ہے دل کے تعلق کی پایدار گرہ
حیف خم، افسوس ساقی، ہائے مینا، وائے مے
جام نا پیدا ہوئے خالی پڑی ہے جائے مے
جوں جلے کے حق میں نافع مرہم کافور ہے
زخم مخموری کے حق میں ہے مجرب لائے مے

اپنے نہ دامن میں گہر چاہیے
اشک کے قطروں میں اثر چاہیے
پائے طلب کھینچ کے بیٹھوں کہاں
خانہ نشینی کو بھی گھر چاہیے

جھگڑنے تجسے تو پیارے حجاب آتا ہے
و گرنہ بات کا تیرے جواب آتا ہے
گیا ہے چوک میرا گھر یہ کس سے کہتے ہو
کبھو کبھو بھی یہ خانہ خراب آتا ہے

نہ کہا حیا سے تو کیا ہوا،
کہا صاف مونہہ پہ تو کیا رہی

نہ وہ حسن جس پہ جفا نہیں،
نہ وہ آن ہے نہ ادا رہی

تم دیکھتے تھے سونہہ عاشق کا
مضمون دودیدہ، نہ تم سمجھے
تصریح بیان کچھ خوب نہیں
کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے

بیان نے دو ایک مرثیے بھی لکھے ہیں جو سادہ اور پر اثر ہیں، قافیہ ردیف خوب ہے:

گیا یہ کون دنیا سے نراسا
لیا جنگل میں جا کر کن نے باسا
گلا کاٹا گیا کس کا پیاسا
رسول اللہ کا پیارا نواسا الخ

بعض ماخذ:
۱ - بستان آصفیہ - (مانک راؤ وٹھل راؤ) مطبوعہ حیدرآباد دکن
۲ - تذکرہ شعرائے اردو (اسپرنگر کیٹلاگ) مطبوعہ
۳ - تذکرہ مخزن نکات - (قایم چاند پوری) مطبوعہ
۴ - تذکرہ چمنستان شعرا - (شفیق اورنگ آبادی) قلمی آصفیہ
۵ - تذکرہ گلشن بیخار - (شیفتہ) مطبوعہ
۶ - تذکرہ ہندی گویان - (مصحفی) مطبوعہ
۷ - دیوان ہمدم (گلاب چند ہمدم تلمیذ بیان) مطبوعہ حیدرآباد دکن
۸ - دیوان بیان (احسن اللہ خاں) قلمی کتب خانہ آصفیہ وسالار جنگ وبابائے اردو
۹ - رسالہ اردوئے معلی، علی گڑھ - ۱۹۰۵ع جلد نمبر ۵ شمارہ ۹ -
۱۰ - رسالہ مکتبہ حیدرآباد دکن - جلد ۲ - ۱۹۲۹ع مضمون شفیق ازعمر یافعی مرحوم
۱۱ - فہرست توضیحی کتب خانہ سالارجنگ مرتبہ ہاشمی - مطبوعہ
۱۲ - فہرست توضیحی کتب خانہ آصفیہ (سنٹرل لائبریری) حیدرآباد دکن مرتبہ ہاشمی - مطبوعہ

اردو نامہ

ہندوستان میں حاصل کرنے کا پتا

ہندوستان میں ''اردو نامہ'' کے شائقین

رائٹرز ایمپوریم پرائیویٹ لمیٹیڈ

خورشید بلڈنگ، فیروز شاہ مہتا روڈ، بمبئی - ۱

سے رجوع کریں

یا براہ راست دفتر اردو نامہ، اردو منزل، جمشید روڈ، کراچی کو چندہ ارسال فرمائیں۔

مکتوب غالب

تحسین سروری

مارچ ۱۹۲۷ء کے "معارف" میں جناب ضیاءالدین احمد برنی صاحب نے "غالب وصہبائی کے خطوط" کے عنوان سے غالب کا ایک اردو خط اور صہبائی کا ایک فارسی خط شایع کیا تھا۔ یہ دونوں خط مولوی ضیاءالدین خاں ضیا دہلوی کے نام ہیں۔ برنی صاحب کو یہ خطوط مکتوب الیہ کے صاحبزادے سید منورالدین صاحب سے ہمدست ہوئے تھے۔ وہ اپنے نوٹ میں ضیاءالدین خاں ضیا کے علمی کارناموں اور ان کے شاندار کتب خانے کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"........ اتفاق سے اس ذخیرے میں سرسری تلاش کے بعد غالب کے دو خطوط نکل آئے ہیں جو غالباً اردوئے معلیٰ کے مروجہ اڈیشن میں درج نہیں ہیں، اس طرح خدا جانے اور کتنے خطوط ہوں گے جو اسی طرح درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ بہر حال یہ اصلی خطوط ہیں جو غالب کی مہر کے ساتھ محفوظ ہیں جو ان کی صحت کا بہترین ثبوت ہے...... علاوہ ازیں صہبائی مرحوم کا بھی ایک خط دستیاب ہوا ہے جسے میں تبرکاً پیش کرتا ہوں۔ اس وقت غالب کا صرف ایک خط پیش کیا جاتا ہے اور دوسرا خط بعد کو ہدیہ ناظرین کیا جائے گا۔"

اسی مکتوب الیہ کے نام دو اور خط ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے جنوری ۱۹۳۴ء کے رسالہ ہندستانی (الہ آباد) میں اپنے مضمون "کچھ اور بکھرے ورق" کے ساتھ شایع کئے تھے۔ یہ دونوں خط مولانا غلام رسول مہر کے مجموعہ خطوط غالب اور بعد کو خلیق انجم صاحب کی کتاب "غالب کی نادر تحریریں" میں شامل کرلیے گئے ہیں۔ تیسرا خط جسے جناب ضیاءالدین احمد برنی نے شایع کردیا ہے وہ یہ ہے:

"مولوی صاحب جمیل المناقب،

مولوی ضیاءالدین خاں صاحب کی خدمت میں بعد سلام عرض کیا جاتا ہے کہ میں عالم نہیں مگر شرف علم اور فضیلت علماء میرے دل نشین ہے اور علم کو زبان عربی میں منحصر جانتا ہوں۔ اللہ اللہ علم عربی کی وسعت صرف نحو، منطق، فلسفہ، تفسیر، حدیث، فقہ، پانچ سات برس تک آدمی اس کو تحصیل کرسکتا ہے۔ یعنی طب و نجوم و ہیئت و ہندسہ و ریاضی اور اس کے سوا اور علوم سب عربی زبان میں ہیں... فارسی زبان بعد تباہ ہونے یزد جرد کی سلطنت کے مٹتی گئی، یہاں تک کہ بقدر ایک بولی کے رہ گئی...... پارسی جو مہراسپ کے عہد سے یزدجرد کے عصر تک تھی، مفقود بلکہ معدوم ہے۔ خاطر نشان رہے کہ یہ پارسی زبان جو اب ہند و عرب و عجم میں مروج ہے، واضع اس کے اکابر عرب و عظمائے عجم ہیں۔ ان واضعوں نے اس کے قواعد منضبط نہیں کئے۔ گویا ان دونوں گروہ کے علماء نے بہ اتفاق رائے ہمدگر اس کو ضرور نہ جانا۔ اب جو میاں انجو اور عبدالرشید اور ٹیک چند اور آرزو، رسائل قواعد فارسی تصنیف کر گئے ہیں، اس کے سوا کہ قواعد منضبطہ عربی پر منطبق کردیا ہے اور کیا کمال

کیا ہے۔ بعینہ یہی حال اردو کا ہے۔ واضعوں نے قواعد منضبط نہ کئے۔ اب میاں روشن علی جونپوری اور ان کی امثال و نظائر ہزار در ہزار رسالے تالیف کر رہے ہیں۔ خیر یہ جملۂ معترضہ تھا۔ علم فارسی میں کلام ہے۔ اگر متعلم فہم درست اور ذہن رسا رکھتا ہو تو سال بھر میں تحصیل تمام ہے۔ ابوالفضل و سہ نثر ظہوری، سکندر نامہ و یوسف زلیخا والسلام مع الاکرام۔ ہاں اس زبان کے دقائق و لطائف جاننے کو طبیعت کا لگاؤ کہ موہبتی ہے اصل محکم اور اس کے بعد رودکی سے لے کر قاآنی تک کا کلام غور سے دیکھنا۔

یہ شخص ایران کا تھا، فاضل تھا، اس کی رحلت کو دس بارہ برس ہوئے ہوں گے۔ کل جو آپ نے میری زبانی کچھ کلام مجھ سے فرمایا تھا وہ تقریر ناقل کی بدلی ہوئی ہے۔ میرا قول یہ ہے کہ عربی کے زور سے فارسی کا علم حاصل نہیں ہو سکتا اور انتہا اوس کی جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں وہی نظم و نثر ہے۔ اس علم فارسی کا منشا مناسب طبع اور مشاہدۂ کلام اہل زبان ہے، وہ وہبی یہ کسبی۔

ایک مجلد درفش کاویانی نذر کرتا ہوں، تخطیۂ اہل فرنگ و تصحیح لغات کو بھاڑ میں ڈالو، جہاں سے فوائد شروع ہیں وہاں سے ہر فائدہ کو بغور پڑھو۔ ترکیب کلمات فارسی بتاتا ہوں اور وہی تحریر میں لاتا ہوں۔ نہ تم جاہل ہو نہ نا منصف۔ یقین ہے کہ اپنی جگر کاوی کی داد تم سے پاؤں گا، آغاز فوائد کے ورق میں کاغذ واسطے نشان کے رکھ دیا ہے''۔ نامہ سیلہ اسداللہ

رسالۂ ہندستانی سے خطوط غالب میں ضیاء الدین خاں ضیا کے نام کے جو دو خط منقول ہوئے ہیں اُن کے پہلے خط میں غالب، ضیاء الدین خاں کو لکھتے ہیں:

''پہلا رقعہ بعد پڑھنے کے یا نقل لینے کے استفتاء کے کاغذ کے ساتھ مجھ کو واپس مل جائے''

اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ پہلا رقعہ یہی ہوگا جسے میں اوپر نقل کر آیا ہوں۔ اس طرح ضیا دہلوی کے موسومہ تین خطوط کی ترتیب میں یہ پہلا خط ہونا چاہیے۔ یہ خط یا اس کی نقل غالب جو طلب کرتے ہیں تو اس کی غایت یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کے خطوط کا جو مجموعہ زیر ترتیب تھا اور جس کی ترتیب میں وہ خود بھی دلچسپی لینے لگے تھے، اس میں اس خط کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے۔

اگرچہ اس خط پر کوئی تاریخ ترقیم نہیں ہے، لیکن غالب کے اس جملے سے اس کے تعین میں مدد ملتی ہے:

''ایک مجلد درفش کاویانی نذر کرتا ہوں۔''

۸۔ جنوری ۱۸۶۶ع کو جب غالب رامپور سے دلی واپس ہوئے ہیں تو درفش کاویانی کی تین سو جلدیں چھپ کر آ گئی تھیں، چنانچہ وہ آتے ہی اپنے دوستوں، شاگردوں اور قدردانوں کے نام اس کی جلدیں بموجب فرمائش خود اپنی طرف سے بھیجنے لگے۔ ظاہر ہے

ان ہی دنوں مولوی ضیاءالدین خاں ضیا کو بھی ایک جلد بھیجی ہوگی۔

خطوط غالب میں جو دوسرا مختصر ساخط ہے، اس پر ۲۷ - فروری ۱۸۶۶ع درج ہے۔ اس تاریخ سے بھی میرے خیال کی تائید ہوتی ہے، گویا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ضیا دہلوی کے نام کے یہ تینوں خطوط غالب ۱۸۶۶ع میں مرقوم ہوئے۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ مولانا غلام رسول مہر نے جو خطوط غالب مرتب کر کے اول مرتبہ ۱۹۵۱ع میں لاہور سے شایع کئے تھے، اس کا مقصد یہ تھا کہ غالب کے وہ تمام خطوط جودستیاب ہونے کے باوجود منتشر تھے یکجاہوجائیں، چنانچہ موصوف تحریرفرماتے ہیں:

"اس مجموعے میں مرزا کے وہ تمام خطوط آگئے ہیں جن کا مرتب کو سراغ مل سکا۔ صرف دو مجموعوں کو چھوڑا گیا۔ ایک مکاتیب رامپور کا مجموعہ دوسرا منشی نبی بخش حقیر کے نام خطوط کا وہ مجموعہ جو نادرات غالب کے نام سے چھپا۔"

مولانا مہر کے اس مجموعے کی اشاعت کے دس سال بعد (۱۹۶۱ع میں) خلیق انجم صاحب کا مرتب کیا ہوا مجموعہ "غالب کی نادر تحریریں" دہلی سے شایع ہوا، اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ غالب کی بکھری ہوئی تحریروں کو سمیٹ لیا جائے۔ اس کتاب کے مرتب کے الفاظ یہ ہیں:

"غالب کی وفات سے اب تک مختلف رسالوں میں ان کے خطوط شایع ہوتے رہے ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان تمام موتیوں کو جو لگ بھگ سو سال کے حریدوں میں بکھرے پڑے ہیں، ایک لڑی میں پرودوں۔ اس مجموعے میں وہ تمام خطوط شامل کئے گئے ہیں جو غالب کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ البتہ دو تین خطوط ایسے بھی ہیں جو خطوط غالب مرتبہ مولوی مہیش پرشاد اور خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر میں آگئے ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ مولانا مہر اور خلیق انجم صاحب نے غالب کی تحریروں کو فراہم کرنے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے، لیکن مولوی ضیاءالدین خاں ضیا کے موسومہ اس مطبوعہ خط کا انہیں سراغ نہ ملنا تعجب سے خالی نہیں۔ میری نظر سے کوئی ایسا مضمون بھی نہیں گزرا جس میں غالب کے اس خط کی نشان دہی کی گئی ہو، اگر کسی صاحب کے علم میں ایسا کوئی مضمون ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ میں ان کا ممنون ہوں گا۔

جیسا کہ جناب برنی صاحب نے اپنے نوٹ میں لکھا ہے، موصوف کو غالب کے دو خط دستیاب ہوئے تھے، لیکن معارف کے مذکورہ شمارے میں انہوں نے ایک ہی خط شایع کیا۔ میں نے محترم ضیاءالدین احمد برنی سے مل کر غالب کے دوسرے خط کے متعلق دریافت کیا تو موصوف نے بتایا کہ مولوی منورالدین صاحب نے دوسرے خط کی نقل دوسری ملاقات میں دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ ہر بار ٹالتے رہے۔ اب خدا جانے اس خط کا کیا حشر ہوا، اور مولوی منورالدین صاحب کا بھی کوئی پتہ نہیں کہ کہاں ہیں۔

گلبنِ اردو

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

مولوی محمد اسمعیل میرٹھی کی بعض تصنیفات بدقسمتی سے ہنوز تشنۂ طباعت ہیں۔ انہی میں ان کے مختصر مضامین کا مجموعہ ''گلبن اردو،، بھی ہے ۔ ذیل میں اس کے چند مضامین پیش کئے جاتے ہیں جو جناب اسلم‌سیفی صاحب (ابن مولوی صاحب مرحوم و مرتب‌کلیات اسمعیل وغیرہ) نے اردو نامہ کے لئے عنایت فرمائے ہیں ۔ مولانا کی سادگی بیان یہاں بھی قابل رشک اور درسی کتابوں کے مصنفین کے لئے مثال ہے۔ (ادارہ)

زبان کے قواعد

کبھی کبھی طالب علموں کو یہ وہم پیدا ہوا کرتا ہے کہ زبان کے قواعد پڑھیں تو عربی کے، فارسی کے، سنسکرت کے یا انگریزی کے، بھلا یہ ہماری روز مرہ کی بولی جس کو بچپن ہی سے بولنا سیکھ گئے ہیں، آج اس کے قواعد پڑھ کر کیا لیں گے، جو بولیاں اب بولتے ہیں وہی پڑھ لینے کے بعد بھی بولیں گے۔ اس کی قواعد کا ہماری بول چال پر، تحریر و تقریر پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ بے شک تم نے ٹھیک کہا، بادی‌النظر میں تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا سوچو سمجھو اور اپنی اس سوچ سمجھ کے پترے کھولو تو ابھی روشن ہوجائے گا کہ فنون ادبیہ کا عالم و جاہل کبھی برابر نہیں ہو سکتا۔ اس میں اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ روز مرہ کی معمولی بات چیت، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، نون تیل لکڑی کے متعلق تو سب آدمی، گنوار ہوں، یا شہری، امیر ہوں یا فقیر، شریف ہوں یا رذیل، اپنے اپنے محاورے کے مطابق سب اپنا دلی مطلب زبان سے بیان کر سکتے ہیں۔ ہر پیشے اور حرفے کے آدمی اپنے اپنے کاروبار کی اصطلاحیں بہ خوبی تڑاق پڑاق بولتے جاتے ہیں۔ قلی، چمار، کہار، گراس کٹ، سائیس سبھی اپنی داستان اپنی زبان میں بیان کر سکتے ہیں۔ عالموں کی نسبت نہ یہ توتلے ہیں نہ گونگے، نہ کم سخن نہ کم گو، کسی کی زبان کو کو نہیں لے گئی۔ مگر یہ بھی تم نے ضرور دیکھا ہوگا کہ عام آدمیوں میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو ستھرائی، سگھڑاپے اور سلیقے سے اپنے جی کی بات دوسرے کے جی میں ڈال سکیں۔ انہیں معمولی باتوں اور ادنیٰ مطالب کو وہ ایسی بد اسلوبی، پیچیدگی اور الجھن سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کا جی الجھنے لگتا ہے، طبیعت گھبرا جاتی ہے۔

شاید تم نے کچہری میں جا کر کبھی کسی

گنوار کے اظہار نہیں سنے کہ کیسی بیہودگی، بے ترتیبی سے اپنا مطلب ظاہر کیا کرتا ہے۔ وہ کیسی کیسی غلطیاں کرتا ہے، کیا کیا اناپ شناپ، خارج از مطلب بکواس کرتا ہے، کبھی کبھی تو نہ اس کا سرا معلوم ہوتا ہے نہ پتا، تو اس وقت حاکم کو اس کا دلی مطلب سمجھنے میں کیا کچھ مغز زنی کرنی پڑتی ہے اور کیسی دقت پیش آتی ہے۔ اگر پھر اسی مطلب کو جو گنوار کی زبان سے بہ ہزار دشواری ادا ہوا، ایک مختار اور وکیل کی زبان سے سنو کس شستگی اور رفتگی سے ریشم کے لچھے اور موتیوں کی لڑیاں کھولتا چلا جاتا ہے۔ کیسی باترتیب اور باقاعدہ بات کہتا ہے کہ سننے والے کے جی میں بیٹھتی، دل میں تاثیر کرتی اور طبیعت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

اب انہیں معمولی باتوں پر بس نہ کرو۔ انسان کی تگ و دو کے واسطے بہت بڑا فراخ میدان معلومات کا کھلا ہوا ہے۔ اس کو بڑے بڑے علوم و فنون کے دریاؤں میں پیرنا ہے۔ بڑے بڑے لق و دق بیابان وعظ و پند طے کرنے ہیں۔ کبھی وہ زمین کی تہوں میں گھس کر پتال کی خبر لاتا ہے، کبھی آسمان کے تارے توڑنے کا ارادہ کرتا ہے۔ کبھی وہ ایسے عقلی اور خیالی سمندروں میں غوطے لگاتا ہے۔ جس کی خودتھاہ کا پتہ نہ کنار و ساحل کا نشان۔ وہاں زبان و بیان کے قالب میں ان تصورات کو ڈھالنا پڑتا ہے اور ان نازک و باریک خیالات کی تصویر کا خاکہ اتارنا ہوتا ہے۔ جن کے سمجھنے میں عقل چکراتی اور بڑے بڑوں کی سمجھ بوجھ ٹکریں کھاتی ہے۔ وہاں بچارے گنوار جاہلوں اور عالم لوگوں کا تو کیا ذکر ہے بلکہ اچھے خاصے زبان دانوں کا بھی ناطقہ بند ہو جاتا ہے۔ جو میدان زبان و بیان کے بڑے بڑے شہ زور پہلوان ہیں، وہی اس مضمون کو طے کرتے ہیں۔

پس اے طالب علمو! تم اپنی زبان کے قواعد کی بابت کوئی حقارت آمیز خیال اپنے دل میں نہ جماؤ بلکہ اس کو خوب جی لگا کر سیکھو اور پڑھو، نہ صرف سیکھو بلکہ تحریر میں، تقریر میں، بول چال میں، خط و کتابت میں ہر طرح پر اس کی مشق بہم پہنچاؤ تو اس وقت تم ایک لائق ادیب، منشی یا شاعر بن سکوگے۔

ذرا ٹھیرو! میرے ذہن میں ایک اور عمدہ مثال آئی ہے۔ بھلا کبھی تم نے میرٹھ کی نوچندی دیکھی ہے؟ خیر کسی میلے تماشے کی سیر تو کی ہوگی۔ تم نے اپنے دیسی کاریگروں کی بنائی ہوئی تصویریں اور مٹی کی مورتیں اور کھلونے ضرور خریدے ہوں گے اور غالباً وہ ولایتی بیش قیمت گڑیاں اور مورتیں بھی دیکھی ہوں گی جو بڑھیا بساطیوں کی دکانوں پر چنی ہوئی رکھی ہین۔ اب تم دونوں دکانوں پر

سے ایک ایک بلی، کتا، بندر، گائے وغیرہ خرید لو۔ دیکھو تو ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ کس کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔ کس کو دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ ان میں کون سی اپنی اصل سے مشابہ ہے۔ کس میں وہ باتیں ہوبہو پائی جاتی ہیں۔ یہ تمہارے بدھو کمہار کی بنائی ہوئی مورت کیسی بھدی بھونڈی آنکریس ہے۔ دھڑ کہیں کو اور سر کہیں کو۔ ناک پچکی ہوئی، آنکھیں ندارد۔ ٹانگیں لمڈھیک کی سی، بھلا جس جانور کی یہ تصویر ہے، کہیں وہ ایسا ہوتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ ہم اس بے کینڈے صورت اور اٹکل مورت کو بھی دیکھ کر یہ پہچان گئے کہ فلاں جانور ہے گو اس کے دیکھنے سے دل کو نفرت اور طبیعت کو گھن سی آتی ہے۔ مگر تمہاری ضد پوری کرنے کو شیخ جی لیے دیتے ہیں۔ دمڑی کو دے تو لے لو۔ اب اس بساطی کے تختے پر جو مرغا رکھا ہے اسے دیکھو۔ کیا نفیس چونچ ہے، کیسی عمدہ کلغی بنائی ہے، دم کس خوبصورتی سے لگائی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب پر پھڑ پھڑا کر اور ٹھاٹ بدل کر ککڑوں کوں بول اٹھے گا۔ میاں ایک آنے کو دے دے تو لے لو، مفت ہے۔ اس بے چارے کاری گر نے ایک آنے میں کیا کھالیا۔ بعینہ یہی کیفیت ان لوگوں کی ہے جو علم زبان کو جانتے ہیں اور نہیں جانتے۔ جاننے والا بھی وہ ہی مضمون ادا کرتا ہے اور انجان بھی، لیکن دونوں کے آثار و صفات میں، خوبی و درشتی میں فرق بین ہے۔ کبھی کوئی بازاری اناڑی گنوار کسی فصیح البیان، طلیق اللسان، شیریں زبان کی برابری نہیں کرسکتا۔ تم نے بعض خوش بیان مقرروں، عمدہ انشا پردازوں کی تحریر تقریر دیکھی سنی ہوگی کہ وہ کیسے عمدہ محاورے، شیریں الفاظ، برجستہ تشبیہیں، بر محل تمثیلیں، نادر استعارے استعمال کرتے ہیں کہ سننے والے کا جی لوٹ ہو جاتا ہے اور بے ساختہ دل سے واہ واہ کی صدا نکلتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ ہر خیال، ہر بات، ہر مضمون، ہر مطلب، ہر مدعا کی تصویر ایسی خوب صورتی سے ایسے بیان میں کھینچ کر دکھاتا ہے کہ گویا دل کا بھید صورت بنا کر سامنے آگیا۔ وہ اپنی سحر بیانی سے غمگین دلوں کو شگفتہ اور مسرور طبیعتوں کو ملول و غم زدہ بنا سکتا ہے، روتی صورتوں کو ہنسنا سکتا ہے، ہنستوں کو رلا سکتا ہے، وہ دلی اور دماغی قوتوں کو ابھار سکتا ہے۔ وہ غصے کو حلم سے، ظلم کو رحم سے، نامردی کو شجاعت سے، سستی کو چالاکی سے تبدیل کرسکتا ہے۔ وہ زبان ہی سے آگ اور پانی کا (کام لے) سکتا ہے۔

وہ زبان ہی سے تیر، تلوار، یا پستول اور بندوق کا کام نکال سکتا ہے۔ وہ لڑا بھی سکتا ہے،

صلح بھی کرا سکتا ہے ۔ غرض وہ تاثیر بیان اور تقریر زبان سے بڑے بڑے تماشے دکھا سکتا ہے ۔ تم یہ بھی خیال مت کرو کہ جو شخص علوم زبان کو پڑھ لیتا ہے وہ ایسا ہی بن جاتا ہے ۔ صاحبو! ایسا بے نظیر و بے بدل تو کوئی شاذ و نادر ہی اپنے عام ہم عصروں میں ہوتا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ جو اس علم کو پڑھتے ہیں وہ کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتے ہیں ۔ بہت نہیں تو تھوڑے ہی سہی۔ کچھ ہونا کچھ نہ ہونے سے ہمیشہ بہتر ہے ۔ تم نے سنا ہوگا ”علم شے بہ از جہل شے“ ۔

ہاں بعض گاؤدی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ سب کچھ پڑھ لیں، کتاب کے کیڑے بن جائیں، پھر بھی صفا چٹ اور چوپٹ ”وہی موچی کے موچی“ رہتے ہیں ۔

ع : کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا

غرض کی دوستی

کسی جنگل میں ایک پرانا درخت تھا۔ اس کی جڑ میں ایک ہوشیار چوہے نے اپنا بل بنا رکھا تھا۔ اسی کے آس پاس ایک بلی رہتی تھی۔ جنگل میں بہت سے شکاری شکار کھیلنے آتے اور جال لگاتے تھے ۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک شکاری نے جال لگایا اور جال میں چھوٹا سا ٹکڑا گوشت کا باندھ دیا ۔ بلی تو گوشت پر جان دیتی ہے، بو پاتے ہی لپکی ۔ ابھی گوشت کھایا بھی نہ تھا کہ جال میں پھنسی اور خود شکار ہو گئی۔ اتنے میں چوہا بھی دانے دنکے کی تلاش میں آہستہ آہستہ بل سے باہر نکلا ۔ چوکنا اتنا کہ کبھی دو قدم آگے بڑھتا کبھی پیچھے ہٹ جاتا ۔ آگے پیچھے، داہنے بائیں دیکھتا بھالتا جاتا تھا کہ یکا یک بلی پر نگاہ جا پڑی ۔ نظر کا دو چار ہونا تھا کہ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ' پاؤں تلے کی زمین نکل گئی مگر ذرا غور سے دیکھا تو اس کو جال میں پھنسا پایا۔ اب ذرا جان میں جان آئی ۔ شکاری کو دعائیں دینے لگا ۔ دوسری طرف جو نگاہ کی تو دیکھتا کیا ہے ، بل کے پاس ہی ایک نیولا گھات لگائے بیٹھا ہے ۔ چاہا کہ پیڑ پر چڑھ کر پناہ لے تو وہاں ایک کوا اسی تاک میں بیٹھا ہے ، پھر تو چوہا مارے ڈر کے تھر تھر کانپنے لگا کہ جاؤں تو کہاں جاؤں اور کروں تو کیا کروں ۔ ذرا اوسان درست ہوئے

تو سمجھ میں آیا کہ اس وقت بلی کو خالہ بنا لینا چاہیے ۔ اس کو میری مدد کی ضرورت ہے' مجھے اس کی حمایت کی۔ اگر ہم سچے دل سے ایک دوسرے کی مدد کریں تو دونوں کا کام بنتا ہے ۔

یہ سوچ کر دبے پاؤں بلی کے نزدیک آیا اور پوچھا ''کہو بی خالہ! جی کیسا ہے؟''

بلی دھیمی آواز سے بولی ''بیٹا! مجھ بدنصیب کا فاقہ تھا ۔ آج خدا خدا کر کے ذراسا ٹکڑا دکھائی دیا تھا کہ جال میں پھنس گئی ''۔

چوہا ۔ ''خالہ ایک نہایت ضروری بات عرض کرنی چاہتا ہوں ۔ وقت ہے تنگ اور جان جوکھوں کا معاملہ، آپ کی اجازت ہو تو کہوں ۔ ''

بلی ۔ ''بیٹا ! جو کچھ تمہیں کہنا ہے شوق سے کہو اوز ایسی ضروری بات ہے تو دیر کیوں لگاتے ہو ؟''

چوہا ۔ '' خالہ جان! اصل بات یہ ہے کہ آپ کو مصیبت میں دیکھ کر میں ہمیشہ خوش ہوتا تھا اور یہی آرزو رہتی تھی کہ آپ پرآسمان سےبلا ٹوٹے اور آپ بالکل اپاہج ہو جائیں ۔ آپ کےخوفناک تیز دانت اور خون خوار فولادی پنجے جن سے ہماری قوم کے ہزاروں ہونہار بچوں کو آپ نے خاک میں ملا دیا ہے، ٹوٹ کے جھڑ پڑیں اور آپ کے دونوں ہاتھ شل ہوجائیں ۔ یہاں تک کہ آپ منہ دھونے کے لیے بھی ترسیں ۔ مجھی پر کیا موقوف ہے، ہماری ساری قوم آپ کے حق میں ہمیشہ یہ بددعا کرتی ہے الٰہی بلیاں دنیا سے غارت ہو جائیں اور ان کی نسل سے اس زمین پر کوئی بسنے والا نہ رہے ۔ لیکن آج موقع ایسا پیش آیا ہے کہ میں آپ کی اس مصیبت میں ہمدردی کے لئے جان و دل سے تیار ہوں۔ اور اس میں ایک خاص غرض پوشیدہ ہے جس میں میرا اور آپ کا دونوں کا فائدہ ہے ' اور فائدہ بھی برابر کا یعنی آپ کی جان میری وجہ سے بچتی ہے اور میری جان آپ کے طفیل میں ۔

اس وقت ایک نیولا میری تاک میں بیٹھا اور کوّا مجھے اچک لینے کی فکر میں ہے ۔ اگر آپ مجھ کو اپنی حفاظت میں لے لیں تو دونوں موذی مایوس ہوکر اپنا اپنا رستہ لیں۔ اس احسان کے بدلے میں یہ خدمت بجا لاؤں گا کہ جال کا ایک ایک بند جن میں آپ جکڑی پڑی ہیں، دم بھر میں کاٹ ڈالوں گا ۔''

بلی نے چوہے کی ساری داستان توجہ سے سنی، پر منہ سے کچھ نہ بولی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا چوہے کی درخواست پر غور کر رہی ہے ۔ تھوڑی دیرتک بلی نےجواب ہی نہ دیا تو چوہا گھبرا کر بولا ۔

چوہا ۔ ”خالہ جان! کیا آپ کے نزدیک میری تجویز مناسب نہیں ۔ غور کیجیے جب آپ کی جان میری وجہ سے بچتی ہے تو آپ کو میری جان بچنے کا کیا غم ہے ؟ ایسے نازک وقت میں غفلت اور کاہلی کرنا عقل کے خلاف ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ جب تک میری جان ہے، اپنے عہد پر ثابت قدم رہوں گا ۔ اب جو کچھ آپ کو منظور ہے فرمائیے ۔ کچھ مجھ ہی کو موت کا سامنانہیں ہے، آپ بھی اپنی شیریں جان سے ہاتھ دھو رکھیے “۔

بلی ۔ ”بیٹا! تیری بات میرے جی کو لگتی ہے ۔ بیشک اتفاق ہی میں نجات ہے اور اسی کی برکت سے یہ توقع ہوسکتی ہے کہ دونوں کی جان بچ جائے مگر یہ تو بتاؤ کہ میں اپاہج بنی ہوئی جکڑی پڑی ہوں ۔ تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں ؟ “

چوہا ۔ ” خالہ جان! بس اتنا کیجیے کہ مجھے اپنی گود میں لے لیجیے، پھر تو میں نیچے ہی نیچے بیٹھا ہوا جال کے بند صاف اڑا دوں گا ۔ “

بلی نے یہ بات پسند کی اور چوہے کو بہت تپاک سے چمکار کر اپنی گود میں چھپا لیا۔ پھر تو بن باسی رستم یعنی نیولا اور زاغ صحرائی یعنی کوا جو دیر سے چوہے پر گھات لگائے بیٹھے تھے، بلی کا برتاؤ دیکھ کر چنپت ہوگئے اور چوہے نے اپنے وعدے کے مطابق چپکے چپکے جال کے بند کترنے شروع کردیے۔ اسی اثنا میں چوہے کے دل میں خیال آیا کہیں ایسا نہ ہو کہ بلی جال سے رہائی پاکر مجھی کو لقمہ بنائے۔

اس خیال کا آنا تھا کہ بند کاٹنے میں سستی کرنے لگا ۔ بلی تاڑ گئی۔ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ہے ۔ شاید چوہے کو میری طرف سے کوئی خطرہ پیدا ہوا ہے ۔

بلی۔ ”کیوں بیٹا! کیا وفاداری اسی کو کہتے ہیں؟ پہلے تو چکنی چپڑی باتیں بنا کر کام نکال لیا، اب اپنا عہد پورا کرنے میں پس وپیش کرتے ہو۔میں تو پہلے ہی جانتی تھی اس دنیا میں وفا کہاں؟ داغ :

یوں وفا اڑ گئی زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

مجھ غریب بے بس قیدی کو ستا کر کیا پھل پاؤ گے ؟“

چوہا۔ ”خالہ جان اس قسم کی بدگمانی میری نسبت نہ کیجیے ، یہ ارادہ تو ہرگز نہیں کہ آپ سے بد عہدی کر کے اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگاؤں۔“

بلی۔ ''اچھا تم بد عہدی اور بے وفائی کو برا سمجھتے ہو تو کام میں اس قدر سستی کیوں کرتے ہو؟ آخر اس کا سبب کیا ہے؟''

چوھا۔ ''سنو! خالہ مجھ کو اپنا وعدہ وفا کرنے میں کچھ عذر نہیں ہے لیکن آپ کی طرف سے ایک خطرہ ہے اور وہی خطرہ میری سستی کا سبب ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ دوستی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو صرف آپس کی الفت و محبت کے لحاظ سے ہوتی ہے اور یہی اصل دوستی ہے۔ ایسی دوستی میں ایک دوسرے پر جس قدر اعتماد کریں تھوڑا ہے۔ اور ایسے سچے دوستوں کا ہاتھ آنا دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ دوسری قسم کی دوستی وہ عارضی دوستی ہے جو کسی غرض کے لیے پیدا کرلی جائے اور میری آپ کی دوستی اسی قسم کی ہے۔ میں آپ کو قید سے چھڑانے کی کوشش اس لیے کرتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے میری جان بچ گئی اور آپ میرے ساتھ اس واسطے محبت کرتی ہیں کہ آپ کی جان کی سلامتی مجھ پر موقوف ہے۔ اب مجھے یہ خوف ہے کہ جال سے رہائی پاکر آپ میرے ہی اوپر ہاتھ صاف نہ کریں' اس لیے مجھ پر فرض ہے کہ ساتھ ہی ساتھ اپنی جان کی حفاظت بھی نظر میں رکھوں۔''

بلی۔ ''بیٹا! تیری عقل، لیاقت، ہوشیاری کی تو میں قائل ہو گئی۔ میں کیا جانتی تھی کہ تو ایسا ہوشیار اور دور اندیش ہے، خیر! اب یہ بتا کہ وہ کون سی صورت ہے کہ دکھیاری کے بند بھی کٹ جائیں اور تجھے بھی میری طرف سے اطمینان رہے۔''

چوھا۔ ''میرے جی میں تو یہ ہے کہ جال کے سارے بند کاٹ دوں مگر ایک بند جو سب سے زیادہ مضبوط ہے اس کو باقی رہنے دوں۔ اور عین اس وقت کہ شکاری جال کھینچنے کے واسطے آ پہنچے' یہ بڑا بند بھی کاٹ دوں۔ آپ کو خود اپنی جان کی فکر ہوگی، مجھ پر حملہ کرنے کا ہوش ہی نہ رہے گا۔''

بلی تاڑگئی کہ چوھا اپنے فن میں کامل ہے۔ اس پر کوئی حکمت نہیں چل سکتی آخر چوہے نے یہ ہی کیا کہ سب بند کاٹ دیے، ایک باقی رکھا اور رات بھر بلی کو دلچسپ قصے، پند آمیز حکایتیں سناتا رہا یہاں تک کہ صبح نمودار ہوئی اور سامنے سے شکاری آتا دکھائی دیا اور بلی نے بوکھلا کر تڑپنا شروع کیا کہ موت کا فرشتہ آپہنچا۔ ادھر چوہے نے جھٹ پٹ دو چار دانت ایسے مارے کہ پھندا کٹ کر الگ ہوگیا۔ پھندے کا کٹنا تھا کہ بلی جھپٹ کر سامنے والے درخت پر چڑھ گئی۔ اس کو اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ چوہے کی طرف دیکھ بھی نہ سکی۔ چوھا بھی جھٹ پٹ اپنے بل میں جا داخل ہوا۔

اور اپنا نوک دار منہ اور گول گول آنکھیں سوراخ سے نکال کر ادھر آدھر دیکھنے لگا۔ شکاری نے جال اٹھایا تو پھندے کٹے ہوئے پائے کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا ماجرا ہے؟ مایوس ہوکر اپنا کٹا پھٹا جال کندھے پر ڈال چلتا بنا۔

بلی نے دیکھا کہ چوہا ذرا سا منہ بل سے باہر نکالتا ہے مگر باہر نہیں آتا۔ ہر چند بہلایا پھسلایا کہ اب تو ہم میں تم میں خالہ بھانجے کا رشتہ ہوگیا۔ تم نے میری جان بچائی، میں نے تمھاری۔ اس محبت اور دوستی کی قدر کرنی چاہیے۔ آؤ گھڑی دو گھڑی مل بیٹھ کر باتیں کیا کریں، لیکن ہوشیار چوہا اس کی باتوں میں آنے والا نہ تھا۔ یہی کہتا رہا کہ غرض کی دوستی بس اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ غرض در پیش ہے۔

دوستی اور کسی غرض کے لیے
وہ تجارت ہے دوستی ہی نہیں (مؤلف)

بے غرض دوستی

ایک کچھوے کا مسکن کسی صاف شفاف چشمے کے کنارے واقع ہوا تھا۔ اسی چشمے کے قریب ایک شان‌دار درخت کھڑا تھا۔ اس کی اونچی اونچی شاخوں میں ایک کوے نے اپنا آشیانہ بنا رکھا تھا۔ پاس پاس کے رہنے سے ان دونوں میں ایسی ملاقات بڑھی کہ ایک دوسرے کا جان نثار، وفادار دوست بن گیا۔

تھوڑے عرصے کے بعد کوے کا گزر ایک جنگل میں ہوا۔ وہاں ایک چوہے سے صاحب سلامت ہوئی تو اس کی خوش اخلاقی اور دانائی کا اثر کوے کے دل پر ایسا ہوا کہ منت و سماجت کر کے اس کو اپنے ہمراہ چلنے پر آمادہ کرلیا اور یہ دونوں وہاں سے اس طرح روانہ ہوئے، کوا چوہے کی دم اپنی چونچ میں دبا کر لے اڑا اور سر شام اس کو اپنے درخت کے نیچے لا اتارا۔

کچھوا کوے کی آواز سن کر چشمے سے باہر نکلا اور اس کی خیر و عافیت اور دیر رسی کا سبب پوچھنے لگا۔ کوے نے آج کے سفر کا مختصر حال بیان کر کے اپنے نئے دوست سے کچھوے کی ملاقات کرائی۔

چوہا اور کچھوا باہم مل کر نہایت

خوش ہوئے - پھر آپس کے مشورے سے خواب و آرام کی خاطر ایک بل اسی درخت کی جڑ میں انتخاب کیا گیا کہ مہمان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو - اب یہ تینوں دوست ایک ہی مقام میں آس پاس رہنے لگے۔

ایک روز چشمے کے کنارے خوش و خرم بیٹھے تینوں رفیق باتیں کر رہے تھے کہ دور سے ایک ہرن نظر آیا، چوکڑیاں بھرتا بے تحاشا بھاگا چلا آتا ہے - تینوں نے خیال کیا کہ ضرور کوئی ظالم شکاری اس غریب کے تعاقب میں ہے - کچھوے نے خوف کے مارے غڑپ سے پانی میں غوطہ لگایا - کوا جھپ سے اُڑا اور اور اونچی شاخ پر جا بیٹھا، چوہا بھی لپک کر اپنے بل میں جا دبکا۔ ہرن نے جو سایہ اور چشمہ دیکھا تو ذرا دم لینے کے لیے نڈھال سا کھڑا ہوگیا۔ مگر خوف زدہ ایسا ہو رہا تھا کہ بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا تھا۔

کوا درخت کی چوٹی پر دوربین لگائے بیٹھا تھا۔ جب دیر تک کوئی آتا دکھائی نہ دیا تو کوے نے آواز دی۔ "دوستو! کوئی خطرہ نہیں آجاؤ۔" یہ سنتے ہی کچھوا پانی سے، چوہا بل سے باہر نکل آیا۔ کچھوے نے دیکھا کہ ہرن بد حواس ہو ہو کر پانی کی طرف دیکھتا ہے مگر پیتا نہیں تو اس نے تسلی دلاسا دے کر کہا کہ "میاں! یہاں کوئی مانع مزاحم نہیں، پیاس لگی ہے تو شوق سے پانی پیو۔ کوئی واقعہ گزرا ہے تو بیان کرو، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم سب تمہاری مدد کو تیار ہیں۔"

ہرن نے جو یہ مشفقانہ باتیں سنیں تو ذرا ہمت بندھی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، کہنے لگا - " شکاری تو میری جان کے لاگو ہو رہے ہیں۔ اس دہشت کے مارے مجھ کو کہیں قرار نہیں - پتا کھڑکا میں ہوا ہوا - آج ایک بھیلیا صبح سے میرے پیچھے پڑا ہے۔ ہزار ہزار ترکیبیں کر رہا ہے - میرے جی میں یہ ہول بیٹھ گئی ہے کہ کسی نہ کسی جتن سے مجھے پکڑ ہی لے گا۔ اسی کے خوف سے بھاگتا بھاگتا یہاں پہنچا ہوں۔" کچھوے نے کہا۔" تم خوف دل سے دور کرو:

صیاد کا یاں گزر نہیں ہے
کچھ جان کا یاں خطر نہیں ہے

تمہارا جی چاہے تو ہماری صحبت میں رہو۔ ہم تین دوست یہاں پہلے سے رہتے ہیں' ہم کو بے حد خوشی ہوگی کہ تین سے چار ہو جائیں گے - بزرگوں کا قول ہے ' "دوستوں کی کثرت سے بلائیں ٹل جاتی ہیں اور حکما فرماتے ہیں کہ دوست ہزار ہوں تو بھی کم جانو اور دشمن ایک ہو تو بھی بہت سمجھو۔"

ہرن کو جو سہارا ملا اور دیکھا کہ یہ محبان مخلص اتحاد اور اتفاق کی بدولت کیسی اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں، تو ہرن نے ایسے دوستوں کے ساتھ رہنے کا عہد و پیمان کیا۔ ان دوستوں نے اس کو نصیحت کی کہ خبردار اس چراگاہ سے قدم باہر نہ رکھنا اور اس چشمے سے کہ امن و امان کی جگہ ہے، کہیں دور نہ جانا۔ ہرن نے یہ مشورہ قبول کیا اور لطف و خوشی کے ساتھ چاروں مل کر اوقات بسر کرنے لگے۔

ایک دن سب احباب جمع ہوئے تو ہرن کو نہ پایا۔ دیر تک انتظار کرتے رہے پھر بھی نہ آیا تو اندیشہ ہوا کہ آج خیر نہیں۔ آخر صلاح ٹھری کہ بھائی کالے خاں تم فوراً پرواز کرو اور دیکھو بھیا ہرچرن داس کدھر چل دیے۔

کالے خاں تھوڑی دیر میں بجلی کی طرح یہ خبر لائے کہ وہ تو صیاد کے جال میں قیدی بنا پڑا ہے۔ کچھوے نے چوہے سے کہا۔ ''سنو یار موسیٰ خاں اس وقت تمھاری ہنرمندی کام دے سکتی ہے۔ جلد پہنچو، وقت ہاتھ سے نکل نہ جائے۔'' موسیٰ خاں نے کالے خاں کو ڈاک کے ہرکارے کی طرح آگے کیا اور اس کی رہبری سے ہر چرن داس تک جا پہنچا۔ دیکھا تو واقعی جال میں پھنسے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ چوہا۔ ''یار! تم جیسا چست، چالاک، عاقل، زیرک اس بلا میں کیونکر آ پھنسا۔''

ہرن ''بھائی کچھ نہ پوچھو۔ شعر:

طمع نے عقل کھوئی حرص نے ایسا دیا جھانسا
کہ آزاد بیابانی کو ان پھندوں میں لا پھانسا

چوہے نے تشفی کی کہ ذرا صبر کرو اب نکالا اور فوراً جال کے پھندے کاٹنے شروع کردئے۔ کچھ دیر کے بعد کچھوا بھی لوٹتا پوٹتا ہرچرن داس کے حال پر نوحہ کرتا آپہنچا۔ شعر:

ٹوٹے وہ ہاتھ جس نے گردن تری پھنسائی
پھوٹے وہ آنکھ جس نے تجھ کو نظر لگائی
آیا ہوں تجھ کو لینے اے میرے پیارے بھائی

ہرچرن داس اس کچھوے کی صدا سنتے ہی بولا ''بھائی جان! آپ کا تشریف لانا تو میری گرفتاری سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اگر جال کے پھندے کٹ گئے اور صیاد آ پہنچا، میں تو دوچار زغندیں مار نظر سے اوجھل ہو جاؤں گا۔ موسیٰ خاں کسی بل میں سٹک جائیں گے اور بھائی کالے خاں تو ہردم ہوائی جہاز پر سوار رہتے ہیں۔ بھلا فرمائیے تو ایسے نازک موقعے پر آپ کا کیا حشر ہوگا؟''

کچھوا۔ ''بلا سے جان جائے تو جائے مرنے کے کے بعد وفادار تو کہلائیں گے۔ ہم سے تو نہیں دیکھا جاتا کہ ایک دوست کی جان خطرے میں ہو اور ہم گھر میں پڑے رہیں۔ خیر!

مرگ انبوہ جشنے دارد۔"

کچھوے نے بات بھی ختم نہیں کی تھی کہ صیاد آتا دکھائی دیا۔ کالے خاں نے جھٹ پٹ ایک بلند شاخ پر اجلاس جا کیا، موسیٰ خاں ایک بل کے تہ خانے میں آتر گئے۔ جال کے بند قریب قریب سب کٹ چکے تھے، ھرن جو تڑپ کر اٹھا تو صاف جال سے باھر، یہ جا وہ جا نظر سے غائب۔

اب صیاد کی سنیے۔ ھرن تو نکل ھی چکا تھا۔ جال دیکھا تو جگہ جگہ سے کٹا ھوا، حیران تھا۔ ع

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ھے!

یکا یک اس کی نظر کچھوے پر جا پڑی تو خیال ھوا کہ ھو نہ ھو یہ انہیں حضرت کے کرتوت ھیں۔ کچھوے کو اٹھا اپنے تھیلے میں ڈال اور تسمے سے تھیلے کا منہ کس، جال اور تھیلا کندھے پر رکھ چلتا بنا۔ دل ھی دل میں کہتا تھا میرے شکار کا تو ستیاناس مارا ھے، دیکھو میاں کچھوے آج تم کو بھی چچا بنا کر چھوڑوں گا۔

صیاد ابھی کچھ بہت دور نہیں گیا تھا کہ تینوں رفیق پھر جمع ھوئے اور لگے سرگوشیاں کرنے کہ یارو بڑا غضب ھوا، کسی طرح کچھوے کی جان بچاؤ۔

ایک آفت سے تو مر مر کے ھوا تھا جینا
اور کیسی پڑی سر پر مرے اللہ! نئی

آخر چوھے نے کہ سب میں ذھین و فہیم تھا، ایک تدبیر نکالی۔ ھرن سے کہا۔ "دوست جلدی لپکو اور صیاد کے آگے سے ذرا لنگڑاتے ھوئے نکلو۔" کوے سے کہا "تم جا کر ھرن پر منڈلانے لگو۔" کبھی کبھی ایک آدھ ٹھونگ بھی جما دینا۔ صیاد سمجھے گا ھرن چوٹ کھایا ھوا ھے، لاؤ یونہی دوڑ کر پکڑ لیں۔ وہ دوڑے گا تو تم دونوں ڈھکاتے ڈھکاتے دور تک لے جانا۔ اس دوڑ دھوپ میں ضرور ھے کہ وہ جال اور تھیلا کندھے پر سے آتار کر الگ رکھ دے گا۔ اس وقت میں تسمے کو کاٹ، بڑے بھائی صاحب کو تھیلے سے نکال، چشمے کے طرف چل دوں گا۔ تم دونوں بھی صیاد کو خوب تھکا کر اپنے مقام پر واپس چلے آنا۔"

اس حکمت پر عمل کیا گیا تو وھی معاملہ پیش آیا جو چوھے نے سوچا تھا۔ ھرن لنگڑاتا ھوا چلا تو صیاد تھیلا اور جال زمین پر رکھ اس کے پیچھے دوڑا۔ چوھا تو تھیلے میں سے کچھوے کو نکال سیدھا چشمے کی طرف ھولیا۔ ھرن اور کوے نے شکاری کو دوپہر تک خوب ھلکان کیا۔ آخرکار وہ دونوں بھی سلامتی کے ساتھ آپہنچے۔ اب چاروں دوستوں نے مل کر چشمے کے

کنارے خوشی کا جلسہ کیا ۔ اس وقت کوے نے ایک اونچی سی شاخ پر بیٹھ کر پہلے تو خوب اپنا گلا صاف کیا، بعد ازاں بلند آواز سے یہ رباعی پڑھی :

ہے نخل محبت پہ بسیرا میرا
یاروں ہی کی یاد میں ہے پھیرا میرا
پیچھے ہم آپ اور پہلے سب یار
ہم نے کبھی سمجھا نہیں تیرا میرا

چوہا بھی ایک پرزا کاغذ کا ہاتھ میں لے کر خوب کودا اچھلا، پھر اس کو دیکھ کر یوں پڑھنے لگا :

میں دامن دشت کا کترنے والا
یاروں پہ ہوں جاں نثار کرنے والا
اک آن میں پھندوں کے اڑا دوں پرزے
بندہ نہیں دشمنوں سے ڈرنے والا

پھر ہرن نے پیاری پیاری نظروں سے دوستوں کی طرف دیکھ کر کان کھڑے کئے اور یہ رباعی نرم لہجے میں سنائی :

یاروں کی محبت نے بلایا مجھ کو
پھر قید سے دشمن کی چھڑایا مجھ کو
بندہ احسان کا بنایا مجھ کو
دے شکر کی توفیق خدا یا مجھ کو

سب سے آخر میاں کچھوے نے اپنی ڈھال سے منہ نکالا اور یوں گوہر افشانی کرنے لگے :

اے چشمۂ دوستی سدا رہ جاری
کر غم زدہ یاروں کی بہت غم خواری
ہم سے ناچیز گھونٹ تیرا پی کر
اٹھے تو نہ دشمنوں سی بازی ہاری

یہ اشعار سن کر پرندوں نے ہوا میں اور مینڈکوں نے پانی میں واہ واہ کا اتنا شور مچایا کہ حاضرین نے کانوں میں انگلیاں دے لیں ۔

ترقیٔ اردو بورڈ کی ایک قابل مطالعہ کتاب

جذبات نادر

حصۂ اول و دوم نیز مثنوی لالہ رخ یک جلد
نادر علی خاں کاکوروی (متوفی ۱۹۱۲ء) کے
جدت آفریں کلام کا مجموعہ ۔ دیدہ زیب طباعت

مع مقدمہ

از جناب ممتاز حسن

ناشر : اردو اکیڈمی (سندھ) کراچی

قیمت مجلد گرد پوش، دس روپے

کلامِ آزردہ

مرتبہ

خلیق انجم

مفتی صدرالدین آزردہ کا کلام یکجا دستیاب نہیں ۔ ہمارے دوست خلیق انجم صاحب نے اسے مختلف ذرائع سے فراہم کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اب تک جتنا کلام جمع ہو سکا ، انہوں نے از راہ عنایت ہمیں ارسال فرمایا ہے اور اردو نامہ کے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش ہے ۔ خلیق انجم صاحب مزید جستجو کر رہے ہیں ۔ کچھ اور کلام کسی صاحب کے علم میں ہو تو مع حوالہ ارسال فرمائیں ۔ شکریے کے ساتھ شائع کیا جائے گا ۔ مخففات مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں ۔ ش ۔ ح ۔ ح

اگر ہم نہ تھے غم اٹھانے کے قابل
تو کیوں ہوتے دنیا میں آنے کے قابل

کروں چاک سینہ تو سو بار لیکن
نہیں داغ دل یہ دکھانے کے قابل

ملیں تم سے کیونکر رہے ہی نہیں ہم
بلانے کے قابل نہ آنے کے قابل

چھٹے بھی قفس سے تو کس کام کے ہیں
نہیں جب چمن تک بھی جانے کے قابل

بجز اس کے تھے خاک پہلے بھی اے چرخ
نہ تھے خاک میں پھر ملانے کے قابل

کیا ترک دنیا میں جب تو یہ سمجھے
کہ دنیا نہیں دل لگانے کے قابل

وہ آئے دم نزع کیا کہ سکیں ہم
نہیں ہونٹ تک بھی ہلانے کے قابل

خدایا یہ رنج اور یہ نا صبوری
نہ تھے ہم تو اس آزمانے کے قابل

رہے ہم نہ کچھ مصطفیٰ خاں کے غم میں
نہ فکر سخن نے پڑھانے کے قابل

نہ چھوڑیں گے محبوب الٰہی کے در کو
نہیں گو ہم اس آستانے کے قابل

ہمیں قید کرنے سے کیا نفع صیاد
نہ تھے دام میں ہم تو لانے کے قابل

نہ بال منقش نہ پرہائے رنگیں
نہ آواز خوش کے سنانے کے قابل

ہوئے ہیں وہ نا قابلوں میں شمار اب
جنہیں مانتے تھے زمانے کے قابل

وہ آزردہ جو خوش بیاں تھے نہیں اب
اشارے سے بھی کچھ بتانے کے قابل (۱)

---

(۱) صہور علی ظہور دھلوی شاگرد ذوق نے آزردہ کی اس غزل کو تضمین کیا تھا ۔ جوان کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے ۔ قاضی عبدالودود صاحب نے یہ غزل نقوش (جون ۱۹۵۶) میں نقل کی تھی ۔ تیر ھواں شعر اس میں نہیں ہے ۔ خم : ۱۳۶۲ ۔

نکلنا ھوا دل سے دشوار کیوں
یہ اک آہ ہے اس کا پیکاں نہیں
یہ ھاتھ اس کے دامن تلک پہونچے کب
رسائیَ جسے تا گریباں نہیں
فلک نے بھی سیکھے ھیں تیرے سے طور
کہ اپنے کیے سے پشیماں نہیں
مرا نامہ' شوق تلووں تلے
نہ ملیے یہ خون شہیداں نہیں
اسی کی سی کہنے لگے اھل حشر
کہیں پرسش داد خواھاں نہیں (۱)
نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمیں و زمیں آسماں نہیں
قاتل کی چشم تر نہ ھو یہ ضبط آہ دیکھ
جوں شمع سر کٹے پہ اٹھا یاں دھواں نہیں
اے بلبلاں شعلہ دم اک نالہ اور بھی
گم کردہ راہ باغ ھوں یاد آشیاں نہیں
اس بزم میں نہیں کوئی آگاہ ور نہ کب
واں خندہ زیر لب ادھر اشک نہاں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
ناز و نگہ روش سبھی لاگو ھیں جان کے
ہے کون ادا وہ تیری کہ جو جا نستاں نہیں

ملنا ترا یہ غیر سے ''ھو بہر مصلحت
ھم کو تو سادگی سے تری یہ گماں نہیں
آزردہ ھونٹ تک نہ ھلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں(۲)
شب جوش گریہ تھا مجھے یاد شراب میں
تھا غرق میں تصور آتش سے آب میں
یا رب وہ خواب حق میں مرے خواب مرگ ھو
آوے وہ مست خواب اگر میرے خواب میں
یا رب یہ کس نے چہرے (۳) سے الٹا نقاب جو(۴)
سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں
کیا عقل محتسب کی کہ (۵) لایا ہے کھینچ کر
سودا زدوں کو محکمہ' احتساب میں
ھم جان و دل کو دے چکے مو ھوم امید پر
اب ھو سو ھو ڈبو دے یہ کشتی شراب میں
کچھ بھی لگی نہ رکھی ڈبودی رہی سہی
دل کو نہ ڈالنا تھا سوال و جواب میں
الفت میں اونکی، اب تو ہے جانوں کی پڑ گئی
دل کس شمار میں ہے جگر کس حساب میں
تھی جہاں میں روز ازل جائے درد کی (؟)
آیا پسند دل میرا اس انتخاب میں (۶)

---

(۱) خم : پانچوں شعر موجود ھیں - گلستان : ۲، ۳، ۵ - جلوہ : ۲، ۳، ۵ (۲) خم : پوری غزل موجود ہے - آثار : ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷ گلستان : ۱، ۲، ۴، ۵، ۷، ۸ واقعات : ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷ طبقات: ۱، ۲، ۴، ۵، ۷ سخن : ۳، ۵ جلوہ : ۷ (۳) ''الٹا ہے رخ سے نقاب جو'' (ارمغان) - (۴) ''ہے'' (خم) - (۵) ''ہے'' (طبقات) - (۶) آثار: ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸ خم : ۲، ۳، ۴، ۵ - طبقات : ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷ گلستان : ۱ ارمغان : ۳، - غالباً : ''تھے جستجو میں'' الخ - ادارہ

یہ کم کے رخنے ڈالیے آن کے حجاب (۱) میں
اچھے برے کا حال کھلے کیا نقاب میں

خورشید زار ہو وے زمیں دے جھٹک ذرا
سو آفتاب ہیں ترے گرد نقاب میں

بے اعتدالیاں مری ظرف تنک سے ہیں
تھا نقص کچھ نہ جوہر صہبائے ناب میں

اوٹھنے میں صبح کے یہ کہاں سر گرانیاں
زاہد نے مے کا جلوہ یہ دیکھا ہے خواب میں

تحقیق ہو تو جانوں کہ میں کیا ہوں قیس کیا
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں

میں اور ذوق بادہ کشی، لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

امداد چشم کیا ہو لگی دل کو آگ جب (۲)
جلنے کے بعد خوں نہیں رہتا کباب میں

ہیں دونوں مثل شیشہ یہ سامان صد شکست
جیسا ہے میرے دل میں نہیں ہے حباب میں

انوار فکر سے نہ ہوا کچھ بھی انکشاف
جتنا بڑھے ہم اور بڑھی جا حجاب میں

یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہد شباب میں (۳)

حسن کی شان سے ہے یہ رہے مستور نہیں
ورنہ ہو تا کبھو یوں جلوہ سر طور نہیں

لاکھ ہنگامۂ منصور دکھادیں دم میں
پر ہم افشائے سرائر میں ہیں مامور نہیں

چارہ اب کیا ہو جو ہو نشتر و مرہم یکساں
کون سا داغ ہے سینے میں جو ناسور نہیں

پرزے پرزے نہ کرو نامہ مرا بن دیکھے
یہ بھی چھاتی سے لپٹتا ہے کہ منظور نہیں

ریختہ یہ ہے کہ جوں آیت محکم ہے صاف
معنیٔ دور نہیں لفظ بھی مہجور نہیں

آستاں ہے ترے در کا وہ تجلی پر تو
پہنچے پاسنگ کو بھی جس کے جبل طور نہیں

عذر کرتے ہی بنی ان کو تجھے جب دیکھا
جو کہا کرتے تھے رسوا ترا معذور نہیں

خانۂ غیر تجلی کدہ ہو، اور نصیب
ہم کو جز روز سیاہ و شب دیجور نہیں

دل ہنر رخنہ ہی کو آگ لگا دی ہم نے
چارہ جز شعلہ بۓ خانۂ زنبور نہیں

ہے نیا قاعدہ یاں ذبح کا، قاتل کی طرف
دیکھنا پھر کے کنکھیوں سے بھی دستور نہیں

میں ہوں اور گوشۂ یثرب، یہ تمنا ہے اب
خواہش سلطنت قیصر و فغفور نہیں

کون سا دن ہے کہ خورشید جہاں تاب سحر
خاک در سے ترے دریوزہ گر نور نہیں

ہیں تو ہم جنس فراہم نہ ہو سامان طرب
بزم ماتم ہی سہی گو انجمن سور نہیں

مژدہ اے چرخ کہ اب میری طرح ہے رکھتا
طاقت اوٹھنے کی ذرا نالۂ رنجور نہیں

---

(۱) نقاب (خم)- (۲) ''جو،، (خم) - (۳) آثار: مطلع کے علاوہ تمام اشعار آثار میں ہیں-
خم: ۱، ۲، ۳، ۵، ۶، ۷، ۸، ۱۰- طبقات: ۵، ۶، ۱۰- سخن شعرا: ۵، ۶، ۱۰ - جلوہ: ۵ -گلستان: ۶ -

محتسب کو کیا بیکار تری آنکھوں نے
ایک میخانہ بھی اس دور میں معمور نہیں
دامن اسکا تو بھلا دور ہے ہاں(۱) دست جنوں
کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں
مدد اے پر تو لطف نبوی کوئی عمل
شمع تنہائی ظلمت کدہ گور نہیں
پایہ عرش بڑھانا تھا وگرنہ یہ نام
لوح پر عرش کی ہوتا کبھی مسطور نہیں
ہوں ادا نظم میں کس طرح مناقب تیرے
سلسلہ یہ متناہی ہے وہ محصور نہیں
ترک روئے خوش آزردہ محالات سے ہے
یوں خدا کی تو خدائی سے ہے کچھ دور نہیں(۲)

پلا ساقیا مے خنک آب میں
کہ تہمتی نہیں توبہ مہتاب میں
گیا دین کیسا حضور نماز
وہ یاد آئے ابرو جو محراب میں
ملے کچھ تو زخم جگر کا مزہ
بجھا کر رکھا تیغ زہر آب میں
الٰہی فلک جس سے پھٹ جائے، دے
وہ تاثیر آہ جگر تاب میں
بلند آشیانوں پہ بجلی گری
جو نیچے تھے ڈوبے وہ سیلاب میں

وہ عریاں ہیں سرما میں، تھی جن کی شب
گزرتی سمور اور سنجاب میں
نہ آئے ہوں آزردہ لینا خبر
پڑی دھوم یہ سارے پنجاب میں (۳)

کاش مقبول ہو دعائے عدو
کیا کروں وہ بھی مستجاب نہیں
اب تو اس چشم تر کا چرچا ہے
ذکر دریا نہیں سحاب نہیں
جمع طوفاں و چشم تر مصرف
اب مصارف کا کچھ حساب نہیں
دھو دیا سب کو دیدۂ تر نے
وہ نہیں درس وہ کتاب نہیں
عشق بازی کا منہ چڑانا ہے
اب وہ موسم نہیں شباب نہیں
تیری آنکھوں کے دور میں کیا کیا
سحر رسوا نہیں، خراب نہیں
مختصر حال چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام، اس کو خواب نہیں
جوں سرا پائے یار، آزردہ
تیرے دیوان کا انتخاب نہیں (۴)
مجھ سا بھی کوئی عشق میں ہے بدگماں نہیں
کیا رشک دیکھ کر مجھے رنگ خزاں نہیں

---

(۱) '' اے،، (خم)۔ (۲) آثار: یہ تمام اشعار '' آثار،، سے نقل کئے گئے ہیں۔ طبقات: ۲، ۳، ۴، ۹، ۱۴، ۱۶۔ خم: ۴، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۲۰ ۔ جلوہ: ۴۔ سخن: ۴

(۳) خم: تمام اشعار خم سے لیے گئے ہیں۔ (۴) خم: پوری غزل موجود ہے ۔ گلستان: ۱، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸۔ جلوہ: ۱، ۲، ۴، ۵، ۷، ۸ ۔ سخن: ۱، ۵، ۶، ۷

آنکھوں سے دیکھ کر تجھے سب ماننا پڑا
کہتے تھے جو ہمیشہ چنیں ہے چناں نہیں

اوٹھ کر سحر کو سجدۂ مستانہ کے سوا
طاعت قبول خاطر پیر مغاں نہیں

افسردہ دل نہ ہو در رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا در پیر مغاں نہیں

اے جذب شوق رحم کہ مد نظر ہے یار
جا سکتی واں تلک نگۂ ناتواں نہیں

شب اوس کو حال دل نے جتایا کچھ اس طرح
ہیں لب تو کیا نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں

کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شب فراق
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

اچھا ہوا نکل گئی آہ حزیں کے ساتھ
اک قہر تھی بلا تھی قیامت تھی جاں نہیں

جانے ہے دل فلک کا مری سخت جانیاں
ان نا توانیوں کو پہنچتی تواں نہیں

کہتا ہوں اوس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ
کہنے کو یوں تو ہیگی زباں اور زباں نہیں

مہکا ہوا ہے بیت حزن دیکھنا کوئی
آیا نسیم مصر کا ہو کارواں نہیں

لب بند ہوں تو روزن سینہ کو کیا کروں
تھمتا تو مجھ سے نالۂ آتش عناں نہیں

کیا کچھ نہ کر دکھاؤں پر اک دن کے واسطے
ملتا بھی ہم کو منصب ہفت آسماں نہیں

وہ شاخ نخل خشک ہوں میں کنج باغ میں
دیکھے ہے بھول کر بھی جسے باغباں نہیں

بے وقت آئے دیر میں کیا شورشیں کریں
ہم پیر و پیر میکدہ بھی نوجواں نہیں

آزردہ نے پڑھی غزل اک میکدہ میں کل
وہ صاف ترکہ سینۂ پیر مغاں نہیں (۱)

اک بات پر بگڑ گئے ، نہ جو عمر بھر ملے (۲)
اوس سے طریق صلح کے کیا صلح گر ملے

باہم سلوک (۳) تھا، پہ ترے دور حسن میں
یہ رسم اٹھ گئی کہ بشر سے بشر ملے

دل محو چشم یار تھا، بیمار ہوگیا
کچھ ان پرستشوں کا بھی آخر ثمر ملے

اے نالہ تو نہ ساتھ دیا آہ کا تو کیا؟
امید کیا اثر کی جو وو بے اثر ملے

صدمہ جگر پہ پہنچے تو ہو دل میں کیوں نہ درد
کیا فرق کچھ جدا نہیں، ہیں دل جگر ملے

ہم کو ہمارے طالع بد نے ڈبو دیا
اچھے تھے گر نصیب تو کیوں چشم تر ملے

---

(۱) آثار: ''۷'' کے علاوہ سب شعر موجود ہیں - خم: ۲، ۶، ۷، ۸، ۱۲، ۱۵، ۱۶ - واقعات: ۲، ۸، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶ - طبقات: ۴، ۵، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۶ - گلستان: ۲، ۷، ۱۵ - جلوہ: ۲ سخن ۸ (۲) قران السعدین جلد ۳ - نمبر - ۱۲ - ۲۷ مارچ ۱۸۴۸ء ص/۱۵۰ - (۳) خم: ملاپ

دھوؤں صد آب تیغ سے اے پنبہ جو کبھو
دامن سے تیرے دامن داغ جگر ملے

امید ہو میں آس کی ملے یوں صبا سے ہم
جس طرح بے خبر سے کوئی بے خبر ملے

جو کچھ نہ دیکھنا تھا، سو وہ دیکھنا پڑا
اس بیوفا سے پہلے تھے کیا دیکھ کر ملے

دیکھے ہنر جو اپنے ہی، وہ جانے اس کا کام
ہم کو تو عیب دیکھ کے اپنے ہنر ملے

مہر جہاں فروز دکھا دوں جبیں کو میں
گر سنگ آستانۂ خیر البشر ملے

ملنے سے اس کے گھٹتی ہے کیا تیری شان حسن
آزردہ خستہ جاں بھی ملے تو اگر ملے (۱)

ہے مفت دل کی قیمت اگر اک نظر ملے
یہ وہ متاع ہے کہ نہ لیں مفت اگر ملے

انصاف کر کہ لاؤں میں پھر کون سا وہ دن
محشر کے روز بھی جو نہ داد جگر ملے

پروانہ وار ہے حد پرواز شعلہ تک
جلنے ہی کے لیے مجھے یہ بال و پر ملے

آنے سے خط کے جاتے رہے وہ بگاڑ سب
بن آئی اب تو حضرت دل لو خضر ملے

کیا شکر کا مقام ہے، مرنے کی جا ہے دل
کچھ مضطرب سے آج وہ بیرون در ملے

عالم خراب ہے نہ نکلنے سے آپ کے
نکلو تو دیکھو خاک میں کیا گھر کے گھر ملے

ہے شام ہجر آج تو او ظالم! او فلک
گردش وہ کر کہ شام سے آکر سحر ملے

گو پاس(؟) ہو پہ چین تو ہے اس بگاڑ میں
کیا لطف تھا لڑے وہ ادھر اور ادھر ملے

دل نے ملادیں خاک میں سب وضعداریاں
جوں جوں رکے وہ ملنے سے، ہم بیشتر ملے

ٹوٹے یہ بخیہ زخم کا، ہمدم کہیں سے لا
خنجر ملے کٹار ملے، نیشتر ملے

تھا اصل میں مراد ڈبونا جہان کا
قابل سمجھ کے گو یہ ہمیں چشم تر ملے

اس کی گلی میں لے گئے آزردہ کو، اسے
دی تھی دعا یہ کس نے کہ جنت میں گھر ملے (۲)

کیا جانو جو اثر ہے دم (۳) شعلہ تاب میں
یہ وہ ہے برق آگ لگا دے نقاب میں

حال اس نگہ کا اس کے سراپا میں کیا کہوں
مور ضعیف پھنس گئی جا شہد ناب میں

ذکر وفا وہ سنتے ہی مجلس سے اٹھ گئے
کچھ گفتگو ہی ٹھیک نہ تھی ایسے باب میں

کیا پوچھتے ہو چارۂ از خویش رفتگاں
سوجا سے چاک جامہ ہے سوزن خلاب میں

(۱) قران السعدین جلد ۳ نمبر ۱۲ - ۲۷ مارچ ۱۸۴۸ء ص-۱۵۰ (۲) - قرآن السعدین جلد ۳ نمبر ۱۲ - ۲۷ مارچ ۱۸۴۸ء ص ۱۴۹ - ۱۵۰ خم خانۂ جاوید ۱۲۶۹،۶۶۳ - سخن شعرا میں ۱۲۶۹۶۳— ۳' گلستان سخن میں نقل ہوا ہے - (۳) ''دل'' (خم) -

آواز صور تیرے شہیدوں کو روز حشر
لگتی تھی اک بھننگ سی کانوں کو خواب میں
جو دیکھتے ھیں اوس سے یہ گزرا کبھو نہیں
یعقوب کے خیال و زلیخا کے خواب میں
ھر ھر روئیں سے خرقہ کے میرے ھے مے چکاں(۱)
غوطے تو سودیے اسے زمزم کے آب میں
اس چشم اشک بار کے کیونکر ھو سامنے
رونے کا مادہ ھی نہیں ھے سحاب میں
قسمت تو دیکھ کھولی گرہ کچھ تو رہ گئے
ناخن ھمارے ٹوٹ کے بند نقاب میں
ھر وقت آرزوئے عذاب جحیم ھے
ھاتھوں سے ھجر کے ھوں میں کیا کیا عذاب ھے(۲)
آنکھ اٹھائی نہیں وہ سامنے سو بار ھوئے
ھجر میں ایسے فرامشگر دیدار ھوئے
کامل اس فرقہ زھاد میں اٹھا نہ کوئی
کچھ ھوئے تو یہی رندان قدح خوار ھوئے
نہ اٹھی بیٹھ کے خاک اپنی ترے کوچے میں
ھم نہ یاں دوش ھوا کے بھی کبھی بار ھوئے
صبح لے آئینہ اس بت کو دکھایا ھم نے
رات اغیار سے ملنے کے جو انکار ھوئے
کچھ تعجب نہیں گر اب کے فلک ٹوٹ پڑے
آج نالے جو کوئی اور بھی دوچار ھوئے
مصر میں آج تجھے دیکھ کے پچھتائے ھیں
سادہ لوحی سے جو یوسف کے خریدار ھوئے
مبتذل میں ھی تو ھوں آپ جو کہیے سچ ھے
رات جھگڑے تو مجھی پر سر بازار ھوئے
یہ ھیں آزردہ جو کہتے ھوئے شیئاً للہ
آج دریوزہ گر خانۂ خمار ھوئے(۳)

فردیات

مر کر بھی ھمارا دل بیتاب نہ ٹھیرا
کشتہ بھی ھوا تو بھی یہ سیماب نہ ٹھیرا (۴)

یہ چھیڑ دیکھ مجھے شب وصل میں کہے
تو اجنبی ھے بند قبا کیونکہ وا کروں(۵)

ناصح یہاں یہ فکر ھے سینہ بھی چاک ھو
ھے فکر بخیہ تجھ کو گریباں کے چاک میں(۶)

اس درد جدائی سے کہیں جان نکل جائے
آزردہ میرے حق میں ذرا تو بھی دعا کر(۷)

ھو نہ دامن گیر کوئی جان کر قاتل تجھے
تو بھی روتا چل جنازے کو ھمارے دیکھ کر(۸)

آمد آمد ھوئی پھر موسم گل کی شاید
ان دنوں چاک کو پاتے ھیں گریباں سے انس(۹)
مکھڑا وہ غضب زلف سیہ فام یہ کافر
کیا خاک جیئے کوئی شب ایسی سحر ایسی
نقشے تو بہت صانع قدرت نے بنائے
پر بن نہ سکا پھر دھن ایسا کمر ایسی

---

(۱) "خون چکاں" (خم) (۲) آثار: تمام شعر موجود ھیں۔ طبقات: ۱، ۳، ۵، ۸، ۹، ۱۰ خم: ۱، ۷، ۸، ۹
(۳) خم: ۱ سے ۸ تک گلستان: ۲، ۳، ۴، ۵، جلوہ: ۲، ۴، ۶ سخن: ۶ (۴) گلشن، خم (۵) گلشن، جلوہ (۶) گلشن، خم۔ (۷) خم، گلشن (۸) خم، گلشن (۹) خم، گلشن

بالیں پہ کھڑا روتا ہے راتوں کو مسیحا
کچھ آن بنی ہے ترے بیمار پر ایسی (١)

ترے مجروح کے سینے میں کچھ گرمی سی باقی تھی
وہیں بس ہو گیا ٹھنڈا جو کھینچا تیرے پیکاں کو

الجھنے کو بلا ہیں آپ بھی کچھ خیر ہے صاحب
لگایا ہاتھ کس نے آپ کی زلف پریشاں کو (٢)

گھر سے گھبرا کے کھلے بالوں ہر اک کھٹکے پر
کیوں نکل آتے ہو دھوکے میں جو بیتاب نہیں

پہلے آثار حیا بھی نہ گئے تھے اتنے
جیسے آنکھوں میں تری اب اثر خواب نہیں

ہزار شیوہ ہیں پنہاں کہ جی ہی جانے ہے
تری نگہ کا تغافل ہے اک جواب نہیں (٣)

گیا کون ساصید افگن ادھر سے
کہ خالی پڑے آشیانے بہت ہیں (٤)

اس شوخ سے مربوط بہت سہل سے ہوتے
گرہم ہی سبک حرکت و نااہل سے ہوتے (٥)

مبتذل دوست بنایا نہ اسے کیوں اول
جس نے اس شوخ کی نظروں میں کیا خوار مجھے (٦)

شہر آشوب

آفت اس شہر میں قلعے کی بدولت آئی
واں کے اعمال سے دلی کی بھی شامت آئی
روز موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا
اہل نا اہل سے خلطہ انہیں زنہار نہ تھا
ان کی خلوت سے کوئی واقف اسرار نہ تھا
آدمی کیا ہے فرشتے کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در
خاک بھی ملتی نہیں ان کو کہ ڈالیں سر پر

زیور الماس کا سب جن سے نہ پہنا جاتا
بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
گاچ کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا
لاکھ حکمت سے اڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا

سر پہ وہ بوجھ لیے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو پھر گرتے ہیں

طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی
مہندی ہاتھوں میں لگا سوتے تو کیا گھبراتی
صبح سے شام تلک نیند نہ ان کو آتی
ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی

ان کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اٹھایا تو سرہانے رکھا

جن کو بن دوش پرستار نہ چلتے دیکھا
صبح سے شام تلک عطر ہی ملتے دیکھا

---

(١) خم : ١ ، ٢ ، ٣ علم : ١ ، ٢ (٢) گلشن بے خار : ١ ، ٢ خم خانہ : ١ ، ٢ سخن شعرا : ١ ، ٢
(٣) حلوہ : ١ ، ٢ ، ٣ سخن : ١ خم : ١ گلستاں : ١ ، ٢ ، ٣ (٤ و ٥) خم ، گلشن ۔ (٦) خم ، گلستاں ، گلشن

کبھو بیدار نہ سورج کے نکلتے دیکھا
پاؤں دابے پہ بھی کروٹ نہ بدلتے دیکھا

وہ ہیں اور دشت ہیں اور کوہ ہیں اور نالے ہیں
قدم اٹھتا نہیں پاؤں میں پڑے چھالے ہیں

عیش و عشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد
لٹ گئے کچھ نہ رہا ہو گئے بالکل برباد

ٹکڑے ہوتا ہے جگر سن کے یہ اُن کی فریاد
پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھو دہلی آباد

کب تلک داغ دل اک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہوجائے زمیں شق تو سماجائیں ہم

دیکھ سکتے نہ تھے جس بات پہ وہ اڑتے تھے
صلح سے زیادہ مزا تھا جو کبھو لڑتے تھے

پاؤں رکھتے تھے کہیں اور کہیں پڑتے تھے
آنچلوں سے نرے مقیش پڑے جھڑتے تھے

ان کو رونے کے سوا شغل نہ کچھ رہتا ہے
ایک دریا ہے کہ آنکھوں سے پڑا بہتا ہے

عطر صندل میں جو دامن کو بسایا کرتے
کنٹھے موتی کے گریباں میں لگایا کرتے

بیٹھ خلوت میں جو زلفوں کو بنایا کرتے
یہ سنگھار آئنے کو بھی نہ دکھایا کرتے

اب نہیں کچھ بھی انہیں زلف پریشاں کی خبر
نہ گریباں کی خبر اور نہ داماں کی خبر

روز بن ٹھن کے نکلنا وہ جوانوں کا کہاں
بیٹھنا ناز و ادا سے وہ دوگانوں کا کہاں

شور ہر کوچہ سے ٹپوں کی وہ تانوں کا کہاں
لطف ساقی کا مزا اور وہ گانوں کا کہاں

وہ مغنی نہ رہا اور وہ ساقی نہ رہا
دہوتی بندوں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا

شکل ایسی کہ خدا اس کو نہ پھر دکھلاوے
ان کی پوشاک کو گر دیکھیں تو پھر قے آوے

نظر آجائیں اگر وہ سر راہے گا ہے
خون اپنا کریں یا اُن کا یہی جی چاہے

جن کے ہاتھوں سے نہ لیں بیر بھی دو کوڑی کے
چاندنی چوک میں پھرتے ہیں وہ ایلے گیلے

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوش جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفٰے خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو (۱)

(۱) یہ شہر آشوب ”انقلاب دہلی“ مرتبہ نظامی بدایونی سے لیا گیا ہے۔

مخففات

خم خانۂ جاوید جلد اول : خم۔ گلستان سخن : گلستان۔ جلوۂ خضر جلد اول : جلوہ۔ آثار الصنادید : آثار۔
واقعات دارالحکومت جلد دوم : واقعات ۔ سخن شعرا : سخن ۔ طبقات شعرائے اردو : طبقات ۔
ارمغان گوکل پرشاد : ارمغان ۔ علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) : علم ۔ گلشن بے خار : گلشن ۔
نقوش جون ۱۹۵۶ء ۔ قران السعدین جلد ۳ نمبر ۱۲، ۲۷ ۔ مارچ ۱۸۴۸ء ۔ انقلاب دہلی مرتبہ نظامی دہلوی

شعبۂ لغت

ڈاکٹر شوکت سبزواری

اشتقاقیات

کچھ لفظ یا کلمے ایسے بھی ھیں جو اصلاً مرکب ھیں لیکن اردو میں مفرد استعمال ہونے کی وجہ سے غیر مرکب سمجھے جاتے ھیں۔ ان میں سے جن کا تعلق اسماء عامہ (سرو نام) سے ھے ان کی حسب ذیل پانچ قسمیں کی جا سکتی ھیں۔

۱۔ اشارات، جیسے:

وہ (اُہ) یہ (اِہ)

۲۔ ظروف:

(الف) زماں، جیسے:

اب، تب، جب، کب۔

(ب) مکاں، جیسے:

جہاں، کہاں، وھاں، یہاں، ادھر، تدھر، جدھر، کدھر۔

۳۔ کلمات تشبیہ، جیسے:

ایسا، تیسا، جیسا، کیسا، ویسا۔

۴۔ کنایات جیسے:

اتنا، جتنا، کتنا۔

۵۔ مبہمات (ضمیر، اشارہ، موصول) غیر فاعلی حالت میں جیسے اِس، اُس، تس، جس، کس (اِن، اُن، تن، جن، کن)۔

اشارات "و"، (اُ) ہ اور "ی"، (اِ) ہ کی ترکیب سے وجود میں آئے۔ اور ظروف، کلمات تشبیہ، کنایات، مبہمات ا (مفتوح، مضموم، مکسور) ت، ج، ک اور ب، ھاں، دھر، سا، تنا، اور س، کی ترکیب ہے۔

جزو اول کی اصل کے بارے میں علمائے فن کا اختلاف میری نظر سے نہیں گزرا۔ سب کا اس پر اتفاق ھے کہ "اَ"، (مفتوح) اِ (مکسور) ضمائر و اشارات کے سہارے (Pronominal Stem) ھیں۔ یہ ویدک اور کلاسیکی سنسکرت اشاروں کی ابتدا میں خصوصیت کے ساتھ اشارہ قریب کے لئے مستعمل تھے۔ "اُ"، (مضموم) زیادہ قدیم نہیں۔ ویدک اسَو (= وہ) سے تراشا گیا ھے۔ اردو کا "و"، اُ (مضموم) کا بدل ھے اور "ی" اِ (مکسور) کی۔ "ت"، واحد غائب کی ضمیر ھے اور خود سنسکرت میں وہ کے معنوں میں ھے۔ "ک" قدیم حرف استفہام ھے۔ "ج" ی کی بدلی ہوئی شکل ھے۔

ان کلمات کے آخری اجزا کے بارے میں البتہ اھل علم کا اختلاف ھے۔ لیکن ان کی تاریخ دریافت ہونے سے پہلے یہ طے ہوجانا

چاہیے کہ یہ کلمے قدیم سے چلے آرہے ہیں یا اہل اردو نے جدا جدا دو کلموں کو جوڑ کر انہیں وضع کیا۔ اگر یہ کلمے اصلاً مرکب ہیں تو ان کے ساتھ مفرد کلمات کا سا سلوک کیا جائے گا اور ان کا تجزیہ کرنے سے پہلے دیکھیں گے کہ قدیم زمانے میں ان کی شکل و صورت کیا تھی۔ عہد بعیدمیں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور کن درجوں سے گزر کر انھوں نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی۔ علم اشتقاق کا تعلق تاریخ سے ہے۔ کسی مرکب لفظ کا تجزیہ کرنے سے اس لفظ کی بناوٹ معلوم ہوجاتی ہے۔ اس کی تاریخ روشنی میں نہیں آتی۔ تجزیہ اس وقت ہوگا جب لفظ اہل اردو کا وضع کردہ ہو یعنی اردو دانوں نے دو کلموں کو جوڑ کر لفظ بنایا ہو۔ لیکن اس صورت میں بھی تنہا تجزیہ کافی نہ ہوگا۔ لفظ کی تاریخ بتانے کے لیے تحلیل کردہ اجزا کی اصل کا کھوج لگا کر یہ بھی بتانا پڑے گا کہ ان کا ماخذ کیا ہے۔

مذکورۂ بالا کلمات کے اشتقاق کے سلسلے میں یہ بات کافی نہیں کہ ”یہ“، مثلاً ’ی، اور ’ہ‘، کا مرکب ہے۔ ”اس“ ’ا‘ اور ’س‘، سے بنا ہے۔ ”اب“، ’ا‘، اور ’ب‘ کی ترکیب کا نتیجہ ہے۔ ”یہاں“ ’ی‘ اور ’ہاں‘ کا اور ”ایسا“، ’ا‘ اور ’سا‘ کا۔ بلکہ ان تمام کلمات کی اولاً قدیم تر یا قدیم ترین شکلیں دریافت کی جائیں گی۔ اس کے بعد قدیم شکلیں مرکب ہوں تو تحلیل کرکے ان کے اجزا کے معانی اور ان کے استعمالات کی تعیین کی جائے گی تب کہیں ان کی اصل روشنی میں آئے گی۔

مثلاً ”یہ“، کو لیجئے اِیہو (EHO) یا ایہا (EHA) اس کی قدیم شکل ہے جو دسویں صدی عیسوی یعنی اپ بھرنش عہد میں رائج تھی۔ اس سے پہلے یہ لفظ سنسکرت اور قدیم ویدک عہد میں ایسہ (ESAH) بولا جاتا تھا۔ ’یہ‘ اور ’اس‘، دونوں اس قدیم لفظ کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں - اول الذکر اپ بھرنش سے آیا اور ثانی الذکر ویدک سے۔

”اب“، کی قدیم شکل کا کھوج نہیں لگایا جا سکا لیکن تب، جب پر قیاس کرکے جو دکن میں تو، ’جو‘ تھے، کہا جاتا ہے کہ یہ اصل میں ”او“، تھا۔ ”ب“ ”و“ کا بدلا ہوا روپ ہے۔ اور چونکہ یہ اپنی موجودہ مرکب شکل میں نہیں ملا اس لئے ڈاکٹر ٹرنر کی ہم نوائی میں اسے ’ا‘، (اشارہ قریب) اور ’و‘، (سنسکرت ایوم اور پراکرت ایووم کا تراشہ) کی ترکیب کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تب اور جب کو میں سنسکرت تاوت (= تب) اور جاوت (= جب) کی پیداوار سمجھتا ہوں۔ اس صورت میں ”اب“، قدیم آریائی فرضی ”آوت“ کی پیداوار ہوگا۔

'' یہاں '' قدیم ویدک اِہا (= یہاں) کی بدلی ہوئی شکل ہونے کی وجہ سے مفرد ہے۔ ' ایسا ' اور اس کے ہمسر دوسرے الفاظ پالی '' ای دس '' اور سنسکرت اے (یہ) + درش (=ش) وغیرہ کلمات کا بگاڑ ہیں اس لئے مرکب ہیں ۔

بہر حال مرکبات کے باب میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ اصلاً مرکب ہیں یا ہم نے ترکیب دے کر انہیں وضع کیا ۔ اور اس کا علم لفظ کی تاریخ کا کھوج لگانے سے ہوگا ۔ اگر تاریخ کا کھوج لگانے سے پہلے لفظ کا تجزیہ کیا گیا تو '' تیلی '' کو بھی جو سنسکرت ' تیلکہ ' یا ' تیلن ' سے وضع ہوا ہے ' تیل ' اور 'ی' (لاحقہ نسبت) کا مرکب بتانے سے لوگ گریز نہ کریں گے ۔

ترقیٔ اردو بورڈ کی چند مطبوعات

باغ و بہار

(میر امن)

مرتبہ :

ممتاز حسین

ڈنکن فاربس کے مرتب کردہ نسخہ مطبوعہ ۱۸۴۷ء
پر مبنی مع مقدمہ ، فرہنگ و حواشی
نفیس ٹائپ کی طباعت ، میر امن کی کلاسکی داستان کا سب سے مستند اور بہترین نسخہ

قیمت مجلد ۶/۵۰ روپئے

ترقیٔ اردو بورڈ
اردو منزل ، جمشید روڈ ، کراچی - ۵
سے طلب کریں

آریائی یا دراوڑی

معین الحق فریدکوٹی

ذیل میں صاحب مقالہ نے بعض الفاظ کے اشتقاق سے بحث کی ہے جن پر ہمارے مدیر لغت ڈاکٹر سبزواری صاحب کا ایک مضمون شمارہ نمبر ۱۲ میں چھپا تھا۔ ' اردو نامہ ' ان مسائل پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اگرچہ جناب مدیر کو صاحب مقالہ کے قیاسات سے اختلاف ہے لیکن ہم اس مضمون کو اردو نامہ میں شائع کر رہے ہیں تاکہ قارئین کو اس پر مزید غور و فکر کا موقع ملے۔ (ادارہ)

محترمی ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب کا فاضلانہ مقالہ اشتقاقیات (اردو نامہ شمارہ چہار دہم) میرے سامنے ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آیا اس بارے میں اپنی ناچیز رائے کا اظہار کروں یا نہیں۔ میرے ایک فاضل دوست نے اپنے ایک ذاتی خط میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا تھا کہ " تحقیق و تدقیق صرف علماء کا کام ہے۔ دوسرے لوگ اگر اس میں دخل دیں گے، تو انہیں اس متعصب پنڈت کی طرح رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا جس نے عربی زبان کے 'انتقال' کو سنسکرت کا ' انت کال ' ثابت کرنا چاہا تھا—— آپ پنجابی کو زبردستی دراوڑی زبان ثابت کرنے کے لئے دور از کار تاویلات بھی نہیں چھوڑتے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اس سلسلے میں پنجابی کو دراوڑی الاصل بتانے کی مجھے کوئی وجہ بتائیں — آپ نے اپنے اس مضمون میں جس طرح سے گل کھلائے ہیں ویسے ہی ہر جگہ کھلاتے ہوں گے۔" یہ الفاظ انہوں نے میرے مضمون " وادیٔ سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات " (اردو نامہ شمارہ ششم) سے متاثر ہو کر ارشاد فرمائے تھے۔

مجھے اپنی بے بضاعتی اور کم استطاعتی کا بخوبی احساس ہے۔ میں نے کبھی بھی اپنی کسی بھی تحریر کو غلطی ہائے مضامین سے مبرا تصور نہیں کیا۔ اس قسم کی نکتہ چینی میرے لئے باعث مسرت ہے کہ آخر اہل نظر اس بارے میں کچھ سوچتے تو ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے ذہنی توازن کو برقرار رکھنے کے لئے یہ جرعہ ہائے تلخ و تیز نہایت ضروری ہیں ورنہ انسان کے ہرگام پر بھٹک جانے کا اندیشہ لاحق ہے۔

موجودہ تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مقامی زبانیں تو ایک طرف خود سنسکرت بھی دراوڑی عناصر سے متاثر ہوئی ہے۔ جب تک

مقامی زبانوں میں دراوڑی عنصر کی موجودگی کے بارے میں کوئی دوسری توضیح پیش نہ کی جاسکے تب تک لامحالہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ عنصر آریاؤں سے قبل ہڑپائی تہذیب کی یادگار ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دراوڑی عنصر کو ہند آریائی عنصر پر سبقت حاصل ہے۔

ہمارے لسانی سرمایے میں بعض الفاظ تو ایسے ہیں کہ وہ سنسکرت میں موجود نہیں لیکن دراوڑی زبانوں میں ملتے ہیں یا اس کے برعکس سنسکرت میں موجود ہیں لیکن دراوڑی زبانوں میں نہیں۔ ایسے الفاظ کے مقام کا تعین کرنے میں ہمیں کوئی دقت لاحق نہیں ہوتی۔ لیکن بعض الفاظ ایسے ہیں کہ وہ علاوہ مقامی زبانوں کے سنسکرت اور دراوڑی زبانوں میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ ان کی اصل کا تعین کرنے میں ہمیشہ غلطی کا احتمال ہے کیونکہ دونوں زبانوں نے ایک دوسری کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ میں نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ اگر کسی لفظ کی اصل ہمیں ہند آریائی گروہ کی دوسری زبانوں مثلاً فارسی، یونانی اور لاطینی وغیرہ میں مل جاتی ہے تو اسے آریائی الاصل تسلیم کریں گے۔ اس کے برعکس اگر ایسا نہ ہو اور اس کی اصل دراوڑی زبانوں میں عمومیت کے ساتھ مروج ہو تو اسے دراوڑی الاصل تسلیم کرلیں گے گو موجودہ صورت میں ان کی ساخت میں بعض اوقات نمایاں تبدیلی واقع ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر شوکت صاحب نے اس حقیقت کی کتنی اچھی وضاحت کی ہے کہ ”زبان کا کوئی لفظ بنیادی ہو یا غیر بنیادی، کبھی ایک حال پر برقرار نہیں رہتا، برابر ادلتا بدلتا رہتا ہے۔“ اسی نظریے کی روشنی میں زیر غور مقالے کے بعض الفاظ کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

پڑھنا: سنسکرت کے لفظ ’پٹھ‘ بہ‌معنی پڑھنا سے مشتق ہے۔ لیکن اس کے ہم اصل الفاظ کسی دوسری آریائی زبان میں نہیں ملتے۔ فارسی میں خواندن، یونانی: ملیٹو، شپوڈاسو، لاطینی: لیشیو، سویڈی: لیسے وغیرہ۔

اس کے برعکس اس اصل کے الفاظ دراوڑی گروہ کی قریب قریب تمام زبانوں میں ملتے ہیں مثلاً

تامل: اٹو (Otu)	بہ‌معنی پڑھنا، مذہبی کتابوں کی تلاوت کرنا، بھجنوں کا دہرانا، بولنا وغیرہ۔
ملیالم: اٹّو (Ottu)	
ٹوڈا: ویٹھ	
کناری: اوڈُ	
کولامی: اوڈ	

پنجابی میں فی زمانہ بھی پڑھنے کے لئے 'اٹھانا' کا لفظ استعمال ہوتا ہے جوکہ غالباً براہ راست دراوڑی زبانوں سے تعلق رکھتا ہے مثلاً "کی توں ایہ چٹھی آٹھا لیئں گا" (کیا تم یہ چٹھی پڑھ لوگے)۔

ظاہر ہے کہ گو 'پڑھنا' کی اصل سنسکرت میں موجود ہے لیکن اس کی جڑیں ہندآریائی گروہ کے بجائے دراوڑی زبانوں میں پیوست ہیں۔

اتوار: سنسکرت کے آدتیہ وارا کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

آدتیہ بہ‌معنی سورج دیوتا اور وارا بہ‌معنی دن۔

یہ دونوں الفاظ آدتیہ اور وارا بھی ہند آریائی گروہ کی کسی دوسری زبان میں موجود نہیں۔ مغربی پاکستان اور جنوبی ہند کی بعض دراوڑی زبانوں میں اس اصل کے الفاظ موجود ہیں جیسے کہ

آدتیہ بہ‌معنی سورج کے ہم اصل الفاظ	سندھی (لار):	ادت، دھنی، تھلی،
	لھندا:	دیہوں
	براہوئی:	دے،
	کناری:	ہوتو
	سمیری:	آتو (بہ‌معنی سورج دیوتا)

وارا بہ‌معنی دن کے ہم اصل الفاظ	گڑابا: ویل کوئی: ویلا	بہ‌معنی سورج، دن کا وقت (پنجابی ویلا بہ‌معنی وقت)
	کھونڈ: ویرا مالٹو: بیرو کورکھ: بیری	ایضاً (پنجابی، اردو سویرا بہ‌معنی صبح کا وقت۔ پنجابی اویرا بہ‌معنی دیر

آچاپت: غالباً دراوڑی الاصل ہے۔

تامل : اتائپو (Ataippu) بہ‌معنی پٹہ پر دینا

کناری : اداپو (Adaipu) بہ‌معنی رہن رکھنا، کرایہ پر دینا

کوئی : جاپو (Japu) ادھار لینا

تلگو : اپو (Appu) ادھار، قرض

اچانک، اچانچک:۔ بہ‌معنی یک دم، فوراً، دراوڑی زبانوں میں مندرجۂ ذیل الفاظ اس سے لگاؤ کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کناری: تتانے (Tattane)	بہ‌معنی فوراً، اچانک	
تولو: ایضاً	یکدم، جلد ہی	
تلگو: تاتوکنا (Tatukuna)		

اچھ: بہ‌معنی ہونا، رہنا وغیرہ (دکنی اردو)

وثوق سے نہیں کہا جاسکتا لیکن ممکن ہے کہ یہ بھی دراوڑی سے مشتق ہو۔ ان معنوں میں اس گروہ کی زبانوں میں ہمیں مندرجۂ ذیل الفاظ ملتے ہیں :

کناری: اجسو Agisu	بہ‌معنی هونا، واقع هونا وجود میں آنا وغیرہ
تولو: اکشو O.x	
کوٹا: اکس Akc	

کہہ نہیں سکتے کہ اس دکنی 'اچھ' کا پوٹھوھاری اچھ بہ‌معنی آنا سے کوئی تعلق ھے یا نہیں جوکہ تلگو کے 'وچھ (Vachchu) بہ‌معنی آنا، هونا، واقع هونا، پہنچنا وغیرہ سے لگاؤ کھاتا ھے ۔ بروھی بس (Bass) بہ‌معنی آنا۔

اس جائزے کی تیاری میں زیادہ تر مندرجۂ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

1. Grierson ; G. A : Linguistic survey of India.

2. Latham ; R. G. ; Ethnology of India.

3. Burrow ; T and Emeneau ; M. B, A Dravadian Etymological Dictionary.

4. Rao ; H. R : Kannada Made Easy.

5. Rao ; H. R. Telugu Without Tutor.

6. Shastri ; G. D : Practical Sanskrit. English Hindi Dictionary.

7. Skeat, W. W ; A concise Etymological Dictionary of the English Language.

''اشتقاق،، کی بنیاد صوتیات پر ھے۔ جب تک صوتی اصولوں کے مطابق لفظی تغیر درست نہ هو اس وقت تک کسی لفظ کے ماخذ کے بارے میں کچھ کہنا درست نہیں۔
(ڈاکٹر شوکت سبزواری)

رسوم دہلی
تصنیف
مولوی سید احمد دہلوی
(مؤلف فرہنگ آصفیہ)
مرتبہ
ترقیٔ اردو بورڈ، کراچی
جس کے ساتھ مؤلف کی حیات و سیرت پر سید یوسف بخاری کا
ایک مقالہ اور ایک فرہنگ شامل ھے۔
ٹائپ کی دیدہ زیب طباعت
قیمت مجلد ۶ روپے
ناشر: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

آئینۂ ادب

منتخب تنقیدی و تحقیقی مقالات کا اشاریہ

مرتبہ

آغا افتخار حسین

تمہید

اس صدی میں علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ تحقیق کے اصول و قواعد میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے، بلکہ علوم کی ترقی کا باعث بڑی حد تک تحقیق کے بہتر قواعد ھی ھیں۔ ہر علم اور فن سے متعلق معلومات کسی ایک جگہ نہیں ملتی بلکہ اسے مختلف جگہ تلاش کیا جاتا ہے اور اس کے بعد ایک منظم شکل دی جاتی ہے۔ اسی کا نام تحقیق ہے۔ زبان و ادب کے بارے میں بھی یہی صورت ہے۔ ہر زبان کے بارے میں نہ صرف اس ملک میں تحقیقی کام کیا جارہا ہے جس کی یہ زبان ہے بلکہ ان ملکوں میں بھی جو اس ملک اور اس کی زبان سے دلچسپی رکھتے ھیں۔ اس لئے تحقیق کے مواد کا دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا ہے، اور اب زبان و ادب کے طالب علم یا محقق کے لئے یہ مناسب خیال کیا جاتا ہے کہ کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے جہاں تک ممکن ہو تمام مواد اس کے علم میں آجائے، چاہے وہ کتابوں کی شکل میں ہو یا رسائل کی، اپنے ملک میں ہو یا غیر ملکوں میں۔

اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے منظم طور پر دستاویزی کام (Documentation) کی ضرورت ہے۔ یہ ترقی یافتہ ملکوں میں بہت بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ مثلاً میں نے پیرس میں قیام کے دوران میں دیکھا کہ پاکستان کی تاریخ، معاشیات، سیاسیات، ادب اور دیگر تمام مسائل پر دنیا کے کسی حصے میں جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے وہ پیرس کے کتب خانوں میں دستاویزی شکل میں وجود ہے۔ بعض ایسے مضامین میری نظر سے گزرے جن کے بارے میں غالباً ہمارے ہاں کوئی مواد نہ ملے، لیکن بہت مفید معلومات پیرس میں موجود ھیں۔ اب یہ کام ہمارے ملک میں بھی شروع کردیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو زبان و ادب کی حد تک اگر یہ کام ترقیٔ اردو بورڈ یا کسی ایسے ھی ادارے میں ہو تو مناسب ہوگا۔

جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے اب

ہمارے محققین اپنے تحقیقی مقالوں کے بعد ''کتابیات،، کی فہرست شامل کرنے کے عادی ہوتے جارہے ہیں ، اور یہ ایک بہت حوصلہ افزا صورت حال ہے۔ لیکن رسائل کے بارے میں ابھی کام کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ اردو زبان و ادب کے موضوعات پر کتابیں تو آسانی سے مل جاتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ اس موضوع پر فلاں کتابیں موجود ہیں، لیکن رسائل میں جو مضامیں شایع ہوتے ہیں ان سب کو بھی محقق کی نظر میں لانا ضروری ہے۔ دستاویزی کام کے لیے سب سے زیادہ اہمیت اسی بات کی ہے کہ پڑھنے والے کو ایک نظر میں معلوم ہوجائے کہ فلاں موضوع پر فلاں مضمون میں ایک نئی اور اہم بات کہی گئی ہے۔

میں نے ان ضروریات کو پیش نظر رکھا ہے۔ جن رسائل میں اردو زبان وادب پر علمی مضامین شایع ہوتے ہیں ' ان کی فہرست میرے عزیز دوست شان‌الحق صاحب حقی نے ازراہ‌کرم مرتب کرکے مجھے دی اور ان رسائل کو منگوانے کا انتظام بھی کروادیا۔ چنانچہ جنوری سنہ ١٩٦٣ع سے اب تک جو رسائل مل سکے ان کے علمی مضامین کی تلخیص مختلف موضوعات کے تحت قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

زیر نظر شمارے میں جس کام کی ابتدا کی گئی ہے اس میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ میں دیگر ممالک سے بھی رابطہ قائم کر رہا ہوں تاکہ معلوم کیا جاسکے کہ وہاں اردو زبان و ادب پرکیا کام ہورہا ہے۔ آئندہ شماروں میں کوشش کی جائے گی کہ ان رسائل کے مضامین کی تلخیص بھی شائع کی جائے جو ہمیں ابھی تک نہیں مل سکے۔ اس سلسلے میں رسائل کے مدیر صاحبان کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اگر رسائل پابندی سے ترقیٔ اردو بورڈ میں آتے رہیں تو آسانی ہوگی۔

اس کام کو کرنے کے لیے منظم مساعی کی ضرورت ہے۔ اس وقت میرے دفتر کے ظہیرنفسی صاحب ایم۔ اے (شعبۂ نفسیات سنٹرل پبلک سروس کمیشن) میرے شریک کار ہیں۔ اس کام کے لئے زیادہ افراد کی ضرورت ہوگی اور میں کوشش کروں گا کہ چند اور '' بلاکشان محبت،، کو اس کام کے لئے جمع کروں۔

کیا اچھا ہوکہ اس سلسلےمیں پاکستانی اور بیرونی یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو میں ایم۔ اے اور پی ' ایچ۔ ڈی کے طلبہ کے لکھے ہوئے مقالات سے بھی استفادے کا موقع ملے۔ ہمیں توقع ہے کہ یونیورسٹیوں کے تعاون سے یہ ممکن ہوسکے گا۔

اشاریہ

اردو رسائل کے چند علمی یا تحقیقی مضامین پر ان مختصر تعارفی حاشیوں کو ترقی اردو بورڈ میں " کارڈانڈیکس " کی صورت میں محفوظ رکھا جاتا ہے ۔ ذیل میں سب سے پہلے اشارے کا لفظ یا نام ہے (جلی حروف میں)، اسکے بعد مضمون کا عنوان (واوین میں)، اسکے بعد مضمون نگار کے نام اور اسکے مقابل جریدے کا نام مع شمارہ یا تاریخ (ادارہ)

اباغی، محمد امین "بادۂ کہن"

قومی زبان، جنوری ۶۴ع

عہد علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ تا ۱۰۸۳) کے شاعر محمدامین بیجاپوری کی ایک بیاض میں سے تین غزلیں۔ یہ بیاض انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں موجود ہے۔

آزاد، ابوالکلام "مولانا آزاد کی ایک قدیم تحریر"

ابو سلیمان شاہجہان پوری

قومی زبان، ۷ فروری ۶۴ع

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تاریخی تحریر۔ یہ تحریر مضمون نگار کی تحریر کے مطابق ۱۹۰۴ع کی ہے جب آزاد کی عمر سولہ سال کی تھی۔ تحریر کا عنوان ہے " ممالک اسلامیہ اور سید احمد خانی خیالات "

تسلیم، منشی انوار حسین، سہسوانی

حنیف نقوی نگار پاکستان مارچ ۶۴ع

تسلیم ۱۸۱۵ع میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ سرکاری ملازمت میں رہے۔ پھر اودھ اخبار سے وابستہ ہوگئے۔ نول کشور پریس کی بیشتر کتابوں کے آخرمیں تقریظیں اور تاریخی قطعات تسلیم صاحب نے لکھے ہیں - فارسی اردو کلام کے نمونے دئیے گئے ہیں -

جنگ نامہ "اردو کی ایک نادر مثنوی"

شریف الحسن اردو نامہ، ۱۵

مثنوی جنگ نامہ مصنفہ راجہ اپورب کشن کنور، مطبوعہ ۱۸۴۶ع کا تعارف جو استنبول میں ملی - مثنوی کے دیباچے میں مہا راجہ نے اپنے وقت کے ہندوستان میں اردو کی حالت اور مقبولیت، انگریزوں کے لئے اس کی ضرورت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے ساتھ اردو کی پیدائش، دوسری ہندوستانی زبانوں سے تقابل اور دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان حلقوں کی قدرومنزلت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مضمون نگار نے مہاراجہ کی اردو انگریزی تحریر پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ آخر میں مضمون نگار نے مثنوی کی کہانی، شاعرانہ خصوصیات اور زبان پر مفصل تنقید کی ہے -

جوان، مرزا کاظم علی " قصۂ نگاریں "

ڈاکٹر عبادت بریلوی - ماہ نو، جنوری ۶۴ع

مرزا کاظم علی جوان کے حالات زندگی اور ان کے شاہکار " قصۂ نگاریں " پر جو کہ کالی داس کے ڈرامے "شکنتلا" پر مبنی ہے، تحقیقی مواد -

دتاسی، " گارسیں دتاسی "

ڈاکٹر محمد حمیداللہ قومی زبان، فروری، ۶۴ع

گارسیں دتاسی کے مقالات و خطبات کے تراجم (زیر طبع) کادیباچہ۔ دتاسی کے مختصر حالات، اردو سے دتاسی کا تعلق، تالیفات اور ان پر تبصرہ۔

درد، ''خواجہ میر درد کا نظریہ تصوف اور ان کی شاعری''

ڈاکٹر وحید اختر   ہم قلم، جنوری ۶۴ع

مضمون نگار کی رائے میں مجدد الف ثانی کے بعد درد ھی نے تصوف کو ایک نیا نظام دیا۔ درد کی شاعری میں تصوف، شعر و موسیقی کے اس خوش گوار امتزاج کے ساتھ ان کے مزاج میں درو یشانہ بےنیازی اور شاعرانہ خود داری بھی موجود تھی،،۔ مضمون نگار نے ایسے اشعار پیش کیے ھیں جو تصوف کے نظریات وجود کو ان کی اصطلاحی زبان میں پیش کرتے ھیں۔ صوفیا کی بعض اصطلاحوں مثلاً '' خلوت در انجمن،، اور ''سفر در وطن،، وغیرہ پر بحث کی گئی ھے۔

دکنی ادب ''عادل شاھی دور میں اردو زبان و ادب کی ایک جھلک''

ملک زادہ طیب انصاری

سب رس، جنوری ۶۴ع

یوسف عادل شاہ نے ۱۵۱۱ع میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس کی قائم کردہ مملکت تقریباً دو سو سال تک باقی رھی۔ اس عرصے میں نو بادشاھوں نے مملکت بیجاپور پر حکومت کی۔ ابراھیم عادل شاہ کے دور میں فنون لطیفہ کی خاص ترقی ھوئی۔ یہ دور اردو ادب کی ترقی کے لیے بھی اھم ھے۔ اس کے علاوہ ابراھیم عادل شاہ اور علی عادل شاہ کا زمانہ بھی اھم ھے۔ اس زمانے میں نصرتی کا ذکر کیا گیا ھے۔ اس کے علاوہ میراں جی کے پوتے شاہ امین الدین اور ایاغی بھی اھم ھیں۔ ان کے کلام کے کچھ نمونے پیش کیے گیے ھیں۔

سید حسین بلگرامی ''آثار علمیہ و ادبیہ''

معارف (اعظم گڑھ) فروری ۶۴ع

سید حسین بلگرامی کے پانچ خطوط جو انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھے۔ یہ خطوط ۲ مئی ۱۹۲۲ع اور ۸ مئی ۱۹۲۳ع کے درمیان لکھے گئے۔

شبلی '' شبلی کے مقالات کا مقام''

فاضل مشہدی

صحیفہ (لاھور) جنوری ۶۴ع

شبلی کی نثر پر اظہار خیال، شبلی کا حالی اور محمد حسین آزاد کے ساتھ موازنہ۔ شبلی کے مقالات کے محاسن اور چند کمزوریاں۔

شبلی ''خلاصہ حیات شبلی کا تاثر''

ابو علی   فاران ۶۴ع

مولانا سید سلیمان ندوی کی تصنیف

"حیات شبلی،،کی تلخیص (از عبدالرزاق قریشی) پر تبصرہ۔ ضمناً" خیات شبلی،، کا پس منظر، حیات جاوید سے موازنہ اور اس کی اشاعت کے رد عمل پر بحث - سر سید اور شبلی کے اختلافات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے -

شفیع "مولوی محمد شفیع مرحوم"

سید ہاشمی فرید آبادی

اردو نامہ، اکتوبر تا دسمبر ٦٣ع

مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم کی سیرت اور ان کی علمی صلاحیتوں اور زبان و مذہب کی خدمات کا اجمالی خاکہ، خاص طور پر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے ترجمے، ادارت اور اشاعت سے متعلق ان کی خدمات کا ذکر۔

صحافت "رسالہ" حسن"

نصیرالدین ہاشمی

اردو نامہ، اکتوبر تا دسمبر ٦٣ع

حیدرآباد کے قدیم علمی رسالے 'حسن' کا تعارف، رسالے کے ایڈیٹر حسن بن عبداللہ کے حالات زندگی، رسالے کی خصوصیات، لکھنے والوں کا تذکرہ، رسالے کے مختلف شماروں کے مضامین کی فہرستیں - واضح کیا گیا ہے کہ یہ رسالہ ستر سال پہلے کے اردو کے دوسرے رسالوں پر اپنے مضامین، اعلیٰ معیار اور معاوضہ پیش کرنے کی وجہ سے فوقیت رکھتا تھا۔

صحافت "اودھ پنچ"

ڈاکٹر احراز نقوی

اردو نامہ، جنوری تا مارچ ٦٤ع

بتایا گیا ہے کہ (١) اردو کا سب سے پہلا مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ،، نہیں بلکہ "مذاق،، تھا جو ١٨٤٥ع میں رامپور سے نکلا- (٢) منشی سجاد حسین نے سب سے پہلے لفظ 'پنچ' کو اپنے اخبار میں استعمال نہیں کیا- "بہار پنچ،، اس سے ایک سال پہلے نکل چکا تھا- تیس مزاحیہ اخباروں کی فہرست مع سنین اجرا دی گئی ہے جن کے نام میں لفظ 'پنچ' موجود ہے (٣) اس غلط فہمی کا سراغ پنڈت برج نرائن چکبست کے ایک مضمون میں ملتا ہے جہاں یہ بات ایک ہندی اخبار "بھارت متر،، کے ایڈیٹر بال مکند گپتا کے بےبنیاد مضمون پر بھروسہ کرکے لکھ دی گئی تھی - مصنف تحقیق کا خاص ماخذ "اختر شہنشاہی،، ہے -

صحافت استانبول کا اردو رسالہ "جہان اسلام،، -

شریف الحسن

اردو نامہ، ١٥ جنوری تا مارچ ٦٤ع

"جہان اسلام،، نامی رسالے سے متعارف کرایا گیا ہے جو پچاس سال پہلے ترکی، عربی، فارسی اور اردو چار زبانوں میں استانبول سے شائع ہوتا تھا - اس کے مالک مولوی ابوسعید العزمی، گجرات (پنجاب) کے باشندے تھے-

اس مضمون میں اس رسالے کی دستیابی، اشاعت، طباعت، ضخامت اور قیمت وغیرہ کے علاوہ مولوی ابوسعید کا مختصر تعارف، رسالے کے اردو صفحات کے مندرجات کی تفصیل اور اقتباسات پیش کیے گئے ہیں اور ضمنی طور پر مولوی ابو سعید صاحب کے طرز نگارش اور مبلغ علم پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

غالب ’’ غالب کہ بقائش باد ‘‘

وجاہت حسین سونی پتی

ماہ نو، فروری ۶۴ع

غالب کی نفسیاتی شاعری پر بحث کی گئی ہے اور متعدد نفسیاتی اشعار کی تشریح بقول مضمون نگار نفسیاتی اصولوں کی روشنی میں کی گئی ہے۔

غالب ’’ غالب کا اعتذار ‘‘

سید قدرت نقوی　　　ماہ نو فروری ۶۴ع

غالب کے اشعار اور خطوط کے اقتباسات کی روشنی میں ان کے آخری ایام میں ان کی ناتوانی، بیچارگی، حالات کی ناسازگاری اور احباب کی ستم ظریفی کا خاکہ۔ بےجا فرمائشوں کے جواب میں ان کے معذرت نامے مع پس منظر۔

غالب ’’ غالب کی شاعری ‘‘

غلام رسول مہر　　　ماہ نو، فروری ۶۴ع

غالب کی شاعری کے ایسے متعدد پہلو پیش کیے گئے ہیں جن پر ابھی تک غور نہیں کیا گیا۔ مثلاً دوسروں سے استفادے اور توارد کی چھان بین، فارسی و اردو کلام کا موازنہ، بعض اشعار کی ازسر نو تشریح، مزید نکتہ آفرینیوں کی تلاش، وغیرہ۔ نئے انکشافات کا امکان ظاہر کیا گیا ہے۔

غالب ’’کلام غالب کا آفاقی پہلو‘‘

ڈاکٹر عبادت بریلوی　　　ماہ نو، فروری ۶۴ع

اشعار کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حیات و کائنات کے مسائل غالب کی شاعری کا خاص موضوع ہیں۔ یہاں تک کہ حسن و عشق کے معاملات اور ذاتی تجربات انسانی اور آفاقی نقطۂ نظر سے بیان کئے ہیں۔ اسی لیے ان کی آپ بیتی بھی جگ بیتی اور ہر دل کی آواز بن گئی ہے۔

غالب، ’’ بزم قدح ‘‘

رفیق خاور　　　ماہ نو، فروری ۶۴ع

ماہ نو کے غالب نمبر کا پیش لفظ۔ غالب کی تنقید پر تنقید۔ اس بات پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ غالب محض ایک روایاتی غزل گو شاعر تھے۔ جدت، گہرائی اور یکسانیت ان کے ہاں کمتر ہے۔ حسین تراکیب اور استعارے بھی سترفی صد مستعار ہیں۔ انہوں نے کوئی مربوط و منظم نظام

حیات یا پیغام پیش نہیں کیا۔ فارسی کلام کا تحقیقی مطالعہ ضروری ہے۔

غالب ''رگ سنگ''

اکبر علی خان ماہ نو، فروری ۶۳ء

غالب نمبر کے سرورق پر شائع شدہ تصویر کا پس منظر، جو طاہر ایم سید کے بنائے ہوئے مجسمے کا عکس ہے۔ مضمون نگار نے بتایا ہے کہ مرنے سے ڈیڑھ دو ماہ قبل غالب کا فوٹو کھینچا گیا تھا اور یہ فوٹو ہی غالب کی صحیح ترین تصویر ہے۔

غالب '' غالب دل گداختہ''

انعام الحق کوثر ہم قلم، فروری مارچ ۶۳ء

غالب کی منفرد خصوصیت یہ ہے کہ وہ .. غم کو جھیلتے ہیں، اسے برداشت کرتے ہیں اور . اس کے تسلط کو توڑتے ہیں اور تھوڑے وقت کے لیے مصروف عیش و نشاط رہتے ہیں۔ ایسے اوقات میں وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہیں اورسنجیدگی کو چھوڑکر شوخی سے کام لیتے ہیں۔ غالب کے اشعار سے مثالیں دی گئی ہیں۔

فغاں '' مرزا اشرف علی فغاں ''

خلیق انجم صحیفہ' (لاہور) جنوری ۶۳ء

مضمون نگار کی رائے کے مطابق فغاں ۱۱۲۹ء اور ۱۱۳۱ء کے کسی سال میں دھلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی کے مختصر حالات، دیوان فغاں اور دیگر کلام پر تبصرہ۔

کامل ''میر حیدرالدین کامل کی اردو شاعری''

میمن عبدالمجید سندھی اردو نامہ ' ۱۵

میر کامل ولی دکھنی وغیرہ کے ہم عصر اور سندھ کے مشہور شاعر تھے۔ فارسی اور سندھی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ کامل کے سوانح، اردو کلام کے اقتباسات اور اس پر تبصرہ۔

کتابیات ''اردو میں کتابیات کی ترتیب اور اس کے چند اصول ''

ڈاکٹر سید حامد حسین

ہماری زبان، ۸ مارچ ۶۳ء

اردو میں منظم تحقیقی کام میں ترقی کے لیے صحیح طریقے پر کتابیات کی ترتیب کی ضرورت روز افزوں محسوس کی جا رہی ہے۔ مضمون میں کتابیات کے لیے چند اصول وضع کیے گئے ہیں۔ مصنف کا نام، کتاب کا نام اور مختلف حوالہ جات کس طرح اور کس ترتیب سے لکھے جائیں، اس بارے میں کچھ تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

کتابیات ''اردو کی کمیاب مطبوعات''

محمد انصار اللہ نظر

ہماری زبان، ۱۵ مارچ ۶۳ء

عبدالرشید خان صاحب، دبیر منزل، کان پور

کے ہاں اردو فارسی کی مطبوعات اور رسائل و جرائد کے ذخیرے کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔ چند کم یاب مطبوعات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

گلشن ہند " گلشن ہند (مخطوطہ) "

افسر امروہی قومی زبان، فروری ۶۴ء

مرزا علی لطف کا معروف تذکرہ جس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) میں موجود ہے۔ اس مخطوطے کا تعارف افسر امروہی صاحب نے کرایا ہے۔

گل کرسٹ "گل کرسٹ اور اس کا عہد"

محمد عتیق صدیقی

اردو نامہ، ۱۴

گل کرسٹ کے بارے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ ۱۸۰۴ء میں شدید علالت کی وجہ سے کالج کی ملازمت سے استعفا دینے کا پس منظر کیا تھا۔ مضمون کے آخر میں چند اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو محمد عتیق صاحب کی کتاب " گلکرسٹ اور اس کا عہد" پر اردو نامے کے بارھویں شمارے اپریل تا جون ۶۳ء میں تبصرہ نگار نے کیے تھے۔

گویا " فقیر محمد خان گویا "

ملک اسمٰعیل حسن خاں

ہماری زبان، ۱۰ مارچ ۶۴ء

فقیر محمد خان گویا، جوش ملیح آبادی کے پردادا، خیر آباد ضلع سیتاپور کے ناظم اور ایک خوش گو شاعر تھے۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ مضمون میں گویا کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں۔

لسانیات " اشتقاقیات "

ڈاکٹر شوکت سبزواری

اردو نامہ، ۱۴

ان الفاظ کی اصل پر بحث کی گئی ہے:
اتوار، اچاپت، اچانک، اچھا۔

لسانیات " سکون اول کا مسئلہ "
(اسکول کے الف کی تحقیق)

سہیل بخاری

اردو نامہ، ۱۴

اس موضوع پر بحث کی گئی ہے کہ اسکول، اسٹیشن، اسٹار وغیرہ جیسے الفاظ کے شروع میں الف مکسور کی آواز کیوں آتی ہے۔ مصنف نے ہند یورپی زبانوں کے متعدد الفاظ کی مثالیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ الف مکسور بولنا ایک لسانیاتی اصول کا نتیجہ ہے۔

لسانیات "اردو کی بنیادی و ذیلی آوازیں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

اردو نامہ، ۱۴

اردو کی بنیادی آوازوں (فونیم Phoneme) اور ذیلی آوازوں (ایلوفون Allophone) کا صوتیاتی اور علم الاصواتی اصول و قوانین کی

روشنی میں جائزہ ۔ مضمون نگار نے تمام حروف کا فرداً فرداً جائزہ لے کر اردو میں ۴۳ بنیادی آوازیں بتائی ھیں -

لسانیات ''لغات الاضداد''

محمد اقبال سلمان اردو نامہ' ۱۴

اردو کے بعض ایسے الفاظ کے معنی اور اصل کی چھان بین جو دو متضاد معنی میں مستعمل ھوتے ھیں۔

لسانیات '' اشتقاقیات''

ڈاکٹر شوکت سبزواری

اردو نامہ ، ۱۴

ان الفاظ پر بحث کی گئی ھے :

اسارا' استری -

لسانیات، ''وادیٔ سندھ اور ترکی و منگولی زبانیں ''

عین الحق فرید کوٹی

اردو نامہ، ۱۴

قدیم ترک قبائل یوہ چی اور ھون کی وادیٔ سندھ میں آمد سے لے کر پاکستان و وسط ایشیا سرسری کے تعلقات کا تاریخی جائزہ'۔ وادیٔ سندھ کے باشندوں اور ترک و منگول قبائل کے قدیم تعلقات، منگول اور ترک قبائل کا وادیٔ سندھ میں ورود' وادیٔ سندھ کے باشندوں کا وسط ایشیا اور آرمینیا وغیرہ میں ھجرت کرکے آباد ھونا ۔ متعدد الفاظ کی اصل ترکی و منگولی زبانوں میں تحقیق کی گئی ھے۔

لسانیات ''اردو کے صوتیے''

ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو نامہ'

ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مقالات کے حوالے سے اردو کے صوتیوں پر مزید بحث اور اس خیال کی تردید کی گئی ھے کہ ع' ط' ث' ص' ژ' ذ' ض اور ظ علٰحدہ صوتیے نہیں ھیں۔

لسانیات '' نذرالاسلام کی زبان کا ایک پہلو''

سید شبیر علی کاظمی قومی زبان، فروری ۶۴ء

موضوع اور پیرایۂ بیان نے نذرالاسلام کو اپنی بنگالی شاعری میں فارسی اور اردو الفاظ استعمال کرنے پر مجبور کیا ۔ ان کی چند بنگالی نظموں کی مثالیں جن میں فارسی اوراردو الفاظ استعمال کئے گئے ھیں۔آخر میں نذرالاسلام کی نظموں سے ایسے الفاظ کا انتخاب پیش کیا گیا ھے جو اردو اور بنگلہ میں مشترک ھی نہیں بلکہ اردو شاعروں اور نذرل کے انقلابی نعروں میں یکساں پائے جاتے ھیں -

متفرق '' بھارت میں اردو''

پنڈت آنند نرائن ملا قومی زبان' جنوری ۶۴ء

خطبۂ صدارت ھے جو لسانی کنونشن کے اجلاس ۶۳ء میں بہ مقام لکھنؤ پڑھا گیا ۔

ھندوستان میں اردو زبان کے موقف اور اس کی ترویج میں دشواریوں کو بیان کیا گیا ھے۔

'' میں حکومت سے یہی درخواست کروں گا کہ وہ اردو کو ہندی میں جبریہ طور پر جذب کرنے کی کوشش سے باز آئے۔''

متفرق ''اردو کی بابت فرانسیسیوں کی چند تحریریں''

آغا افتخار حسین اردو نامہ' ۱۰

اردو زبان کے بارے میں گزشتہ ڈھائی سو سال کے عرصے میں فرانسیسی مصنفوں' سیاحوں اور اخباروں وغیرہ نے اردو کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے' اس کا ذکر کیا گیا ہے اور مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

آخر میں اردو زبان و ادب کے بارے میں اس مواد کا ذکر کیا گیا ہے جو پیرس کے کتب خانوں میں موجود ہے۔

متفرق ''بنگال کے چند ہندو شعرا''

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

قومی زبان' فروری ۶۴ء

بنگال کے نو ہندو شعرا کے مختصر حالات اور نمونہ' کلام۔ شعرا کے نام یہ ہیں:

راجہ جنم جے متر ارمان' مہاراج کرشنا بہادر' اتواری لال ذرہ' راجہ کشن' بابو کشن چندر گھوش' کنور راجہ اپورب کشن بہادر' راجہ جادو کشن بہادر' بابو جگن ناتھ پرشاد ملک۔

مخطوطات ''گنج ہائے گراں مایہ''

افسر امروہی قومی زبان' ۷ جنوری ۶۴ء

مندرجہ' ذیل مخطوطات پر نوٹ شائع کیے گئے ہیں جو انجمن ترقی اردو کراچی میں محفوظ ہیں

(۱) فرائد و فوائد (۲) معجزات نبی کریم (۳) تحفۃ النساء (۴) محی الدین نامہ۔

مخطوطات '' جامعہ' نظامیہ حیدرآباد دکن کے اردو قلمی دواوین ''

نصیرالدین ہاشمی قومی زبان' جنوری ۶۴ء

جامعہ' نظامیہ حیدرآباد (دکن) کے ۲۸ مخطوطات کا ذکر ہے۔ ولی اورنگ آبادی' سودا' وزیر علی صبا (غنچہ' آرزو)' میر تقی میر، انشا' جرأت' چندا' امانت، صاحب قران' رسول بیگ شوق' حفیظ دہلوی ثم حیدرآبادی' عبدالرحیم ضیا' بے باک' رفعت' حیا' وفا، دولہا' شیریں (شاہ بیگم والیہ' بھوپال)۔

نیز' رباعیوں کا ایک مجموعہ جن میں وفا' جذب' نسیم' لائق' انیس' دبیر' درد' رسا' ذکا' بسمل، اسیر' سحر' گویا' نجمی اور مونس شامل ہیں۔

ان کے علاوہ یہ مجموعے بھی ہیں:

رباعیات انیس' کلام (سید شاہ محمد غوث مدنی) قصائد نعتیہ زار (مولوی امداد علی حیدرآبادی)' مسدس فلک (محمد علی خاں)' واسوخت امانت (۱۲۴۷ھ میں مرتب کیا ہوا)' مجموعہ' واسوخت (اس میں رند' خلق' جذب

وغیرہ کے وا سوخت شامل ہیں)' دیوان سحر (دیبی پرشاد)' گلزار داغ -

منظوم داستانیں ''۱۸۰۷ع کی چندمنظوم داستانیں''

نصیرالدین ہاشمی　　جامعہ' جنوری ۶۴ء

کتب خانہ' نواب سالار جنگ بہادر حیدرآباد دکن کی کم یاب مطبوعہ کتابوں میں سے ۱۹ منظوم داستانوں کا تعارف کرایا گیا ہے - جن داستانوں کا ذکر ہے وہ یہ ہیں :

قصہ' بادشاہ روم' ہشت گلزار' تحفہ' جعفر' یوسف زلیخا' مثنوی گلزار نسیم' مثنوی گل و صنوبر' بہارد انش (اس میں بارہ قصے ہیں)-

میر ''میر کا سیاسی اور سماجی ماحول''
(قسط نہم)

ڈاکٹر محمد عمر　　برہان' فروری ۶۴ء

مضمون کی اس قسط میں میر تقی میر کے اقتصادی اور سماجی حالات کا بیان ہے- پہلے حصے میں میر کے کلام سے مثالیں' دوسرے حصے میں امرد بازی سے متعلق مختلف تذکروں سے حوالے -

نادر' کلب حسین خاں ''نادر' ایک تنقیدی مطالعہ''

محمد انصار اللہ نظر

پگڈنڈی' امرتسر' فروری ۶۴ء

اعتصام الدولہ مرزا کلب حسین خاں مبارز جنگ' ناسخ کے تلامذہ میں سے تھے- اپنی کتاب ''تلخیص معانی'' میں نادر نے زبان و بیان کے اصول قلمبند کئے ہیں' جن میں تذکیر و تانیث اور محاورے وغیرہ پر بحث کی گئی ہے- نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں-

ناظم '' دیوان ناظم عطیہ' غالب ''

احمد رضا　　صحیفہ' جنوری ۶۴ء

مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم والی' رام پور کا دیوان در اصل مرزا غالب کا عطیہ ہے- نواب صاحب غالب سے اصلاح لیتے تھے- اخذ و اعطا کی قدیم روایات کا ذکر، غالب کی شخصیت اور کردار کی چند کمزوریوں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے- ناظم کی غزل '' میں نے کہا کہ دعوی الفت مگر غلط '' مضمون نگار کا خیال ہے کہ یہ غالب کے علاوہ کسی کی نہیں ہوسکتی -

''**نظام** رام پوری''

دور آفریدی　　قومی زبان، جنوری ۶۴ء

سید نظام شاہ خلف سید شاہ، ولادت رام پور ۱۸۲۳ء ' وفات ۱۸۷۲ء- مختصر حالات اور نمونہ' کلام -

یہ شعر ان ہی کا ہے :

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

نیشا پوری خاندان ''نیشاپوری خاندان کے شعرا''
محمد انصاراللہ نظر ہماری زبان، یکم مارچ ۶۴ء
فیض آباد کے ایک خاندان کی اردو خدمات کا ذکر کیا گیا ھے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ امین نیشاپوری تھے۔ ان کے فرزند مرزا محمد تقی تخلص کرتے تھے۔ شاعر اور شاعر نواز رئیس تھے۔ مصحفی نے ان کا ذکر کیا ھے۔ ان کے ایک صاحبزادے محمد علی خاں بہادر کا ذکر کیا گیا ھے۔ میر تقی میر اور جرأت ان کے مشاعروں میں آتے تھے۔ آتش بھی تقی کے ملازم رھے۔ آخر میں تقی اور ان کے صاحبزادے حیدر کے کلام کے نمونے پیش کئے گئے ھیں۔

اُردو کی پہلی کتاب

مولانا محمد حسین آزاد کی درسی کتابوں کا سلسلہ

حصہ اول تا چہارم

پیش لفظ

جناب ممتاز حسن (ستارۂ پاکستان)

مقدمہ

ڈاکٹر اسلم فرخی

اس میں مولانا آزاد کی حسب ذیل درسی کتابیں یک جا شامل ھیں:

حصہ اول: اردو کی پہلی کتاب　　حصہ دوم: اردو کی دوسری کتاب
حصہ سوم: اردو کی تیسری کتاب　　حصہ چہارم: اردو کی چوتھی کتاب

نفیس ٹائپ کی طباعت، خوب صورت سرورق، قیمت (ہر چار حصہ یک جلد) ۶ روپے

شائع کردہ: ترقیٔ اردو بورڈ، اردو منزل، جمشید روڈ، کراچی-۵

مراسلات

مولانا عبدالماجد دریابادی ، رئیس احمد جعفری ، دیکشن اکبر آبادی ، آغا افتخار حسین ، عبدالمجید حیرت، جمیل نقوی ، سلیم الرحمن ، قطب محی الدین ، اختر حسن، ذاکر حسین ، مولوی شمس الاسلام ، ذاکر، عندلیب شادانی

کرم گستر۔ السلام علیکم

اب کے افتتاحیہ تو آپ نے بڑے بانکپن سے لکھا۔ دلچسپ بھی اور غازیانہ و مجاہدانہ بھی۔ ماشاءاللہ .... ہمارے سید مسعود حسن صاحب کا مکتوب بھی خوب رہا۔ با موقع بھی، ضروری بھی۔ ہماری آپ کی قوم کا بھی عجیب حال ہے۔ عقیدت ہوئی تو نوبت پرستش کی پہنچادی۔ الجھی تو بس بد تمیزی پر اتر آئی۔ آزاد مظلوم کی تحقیق میں اگر کچھ غلطیاں رہ گئیں تو غلطیوں سے محفوظ آج تک کون رہا ہے۔ کس محقق کی تحقیق کو حرف آخر کا درجہ دیا جاسکتا ہے؟ لغزشوں کی نشان دہی ضرور کیجیے لیکن اپنے فرق مراتب کا لحاظ کرکے اور شرافت زبان و متانت بیان کے ساتھ — ادب میں بے ادبی کیسی؟

حصہ لغت ہمیشہ بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں ، چنانچہ اب کے بھی۔ آپ آخر میں حوالہ جو دیتے ہیں اس میں پہلے نام تصنیف کا دیتے ہیں اور پھر مصنف کا۔ لیکن کہیں اس کے برعکس بھی ہوگیا ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۵۹، کالم ۲، وسط، جہاں "رسوا" پہلے آگیا اور "خورشید بہو" بعد کو۔ اس بے ترتیبی کی کچھ مزید مثالیں صفحہ ۱۶۱ کالم ۲، کے وسط میں نظر پڑیں۔ صفحہ ۱۶۱، کالم ۱، وسط میں ایک حوالہ "سائنس و فلسفہ" کا دیکھا، خیال نہ آیا کس کی کتاب ہے۔ "گھاس کو چرتا" ذرا طبیعت کو کھٹکا۔

رسوا کے نام پر یاد آیا کہ "خورشید بہو" نام کی کوئی کتاب ان کی زندگی میں تو سننے میں نہ آئی تھی ، بعد کو خدا معلوم کن لوگوں نے اسے ان کی جانب منسوب کردیا۔

دریاباد   عبدالماجد دریا بادی

توضیح : حوالے کے اندراج کی بابت ممکن ہے بعض اوراصحاب کو بھی یہی بات کھٹکی ہو، لہذا مکرر وضاحت کی جاتی ہے کہ اگر سنہ تصنیف دریافت ہو تو کتاب کا نام پہلے دیا جاتا ہے ، ورنہ مصنف کا نام مقدم ہوتا ہے اور تصنیف کا مؤخر۔ داھنی طرف جو سنہ درج ہوتا ہے وہ پہلی صورت میں سال تصنیف شمار ہوگا ، اور دوسری صورت میں مصنف کا سال وفات مثلاً :

۱۸۵۱ء (وفات) — مومن، کلیات
(مصنف کا نام مقدم ہے)

۱۸۷۸ء (سال طباعت) — گلزار داغ
(تصنیف کا نام مقدم ہے)

۱۸۰۱ء (سال تصنیف) — آرائش محفل ، حیدری
(تصنیف کا نام مقدم ہے)

چونکہ ذی حیات مصنفین کی تصانیف کا سنہ طباعت یا سنہ تصنیف عام طور پر معلوم ہوتا ہے ، اس لیے تصنیف کا نام پہلے نظر آئے گا اور مصنف کا (اگر ضروری ہوا) تو بعد میں۔ مثلاً :

۱۹۴۳ء — مضامین، عبدالماجد دریا بادی

(ش - ح - ح)

برادر عزیز و مکرم۔ السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ ملا ، اس سے پہلے اردو نامہ بھی مل گیا تھا، آج لغت کے اوراق بھی مل گئے :

کلاہ گوشہ، دھقان بہ آفتاب رسید!

ان اوراق کا انشاءاللہ بامعان نظر مطالعہ کروں گا۔ اور اگر ضرورت ہوئی — جس کا امکان کم ہے — تو اپنے معروضات بھی پیش کروں گا ۔

اس خط میں تو اس اداریے پر خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جو آپ نے عثمانی صاحب کے افکار عالیہ پر تحریر فرمایا ہے ، شاعری میں تو "سہل ممتنع" سنتے اور پڑھتے آئے تھے، نثر میں ایسا نمونہ آج دیکھا ۔ سنجیدہ شوخی، اور شوخ سنجیدگی کا اتنا بہتر امتزاج شاید ہی مجھ کم سواد کی نظر سے کبھی گزرا ہو۔ یہ لوگ جو اردو کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہونے کی سعی، ناکام کرتے ہیں، قابل رحم ہیں۔ لیکن ایسے لوگ ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور اردو کا قافلہ منزل مقصود کی طرف بڑھتا رہے گا ' انشاءاللہ ۔

لاہور رئیس احمد جعفری

مکرمی

جی یہی چاہتا ہے کہ اردو کی ایک ایسی لغت تیار ہو جو خامیوں سے پاک ہو۔ اجتماعی کام میں بہتری کی توقع ہونا ہی چاہیے۔

نظیر اکبر آبادی پر کام کے سلسلے میں میری نظر سے اور لغات کے علاوہ نوراللغات بھی گزری اور جناب اثر لکھنوی نے از راہ شفقت مجھے فرہنگ اثر بھی عنایت فرمائی ۔ ان دونوں لغات میں ایسے مقام نظر پڑے جہاں میں مطمئن نہ ہو سکا ۔ میری رائے یہ بھی ہے کہ فقہ اللغت عربی کی قسم کی ایک مستقل کتاب اردو میں لکھی جانی چاہیے۔ ہر چند کہ اردو زبان اتنی وسیع نہیں ہے جتنی عربی، پھر بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو مرادف سمجھے جاتے ہیں مگر ان کے معنی میں فرق ہے ۔ مثلاً "تیرنا" اور "پیرنا"

یا ''چمک ،، ''جھمک'' اور '' دمک ،،وغیرہ میں اپنے آپ کو سچائی سے اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ کوئی رائے دوں مگر تعمیل ارشاد مین جواب نمبر وار عرض کرتا ہوں۔

(۱) اندھا دھوندی (اندھا دھندی)

'ی' میری رائے میں زائد ہے، کسی سے کبھی سننے میں نہیں آیا۔ غالباً سر سید مرحوم کا تصرف یا تسامح ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے زمانے میں دلی کے بچے بول اٹھتے ہوں۔ صحیح لفظ اندھا دھند ہے، جس میں اندھا کی '' ن ،، غنہ ہے اور '' و '' یقیناً اس زمانے کا املا اور طرز تحریر ہے جب کہ 'اس، کو بھی 'اوس، لکھتے ہیں۔ اندھا دھند کے معنی ہیں بغیر دیکھے، بغیر سوچے سمجھے، اٹکل پچو۔ یہ لفظ مرکب ہے ' اندھ ' اور ' دھند ' سے -

(۲) اندھا کنواں۔ اس کنویں کو کہتے ہیں جس میں پانی نہ ہو۔ جس کنویں میں پانی نہیں ہوتا اس میں روشنی بھی نہیں ہوتی، یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ اندھا کا لفظ روشنی کے عدم پر دلالت کرتا ہے اور اسی لئے اسے اندھا کہا گیا ہے نہ کہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے - بالفرض اگر کنواں اتنا کھودا جائے جہاں پانی نکلنے کا امکان ہی نہ ہو اور پھر اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے تو اسے بھی اندھا کنواں ہی کہیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو کنواں مستعمل نہ ہوگا اس کے منہ پر گھاس پھونس جم جائے گی اور دور سے اس کا منہ نہ نظر آئے گا مگر اس بات سے معنی کا کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ اگر کنویں کے منہ پر گھاس وغیرہ نہ بھی ہو اور اس کا منہ دور سے نظر بھی آتا ہو، لیکن اگر اس میں پانی نہ ہو تو اسے بھی اندھا کنواں ہی کہیں گے۔

(۳) اندھی شادی - بہت قلیل الاستعمال لفظ ہے۔ ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں غیر معمولی طور پر طرفین بغیر ایک دوسرے کو سمجھے بوجھے رشتہ کر لیں۔ اگر کہیں لڑکے اور لڑکی کی ذمہ داری ہو اور وہ نہ سوچیں سمجھیں تو وہ بھی اندھی شادی کہی جاسکتی ہے - اور جہاں سرپرستوں کی ذمہ داری ہو اور وہ سوچے سمجھے بغیر طے کرلیں وہ بھی اندھی شادی کہلائے گی، اسی لئے میں نے ''غیر معمولی'' کا لفظ استعمال کیا ہے -

(۴) اندھی نگری یا اندھیر نگری - عموماً لوگ بولنے میں فرق نہیں کرتے ہیں۔ پھر بھی اندھیر نگری ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں ظلم کا دور دورہ ہو اور اندھی نگری جہاں اچھے برے اور کھرے کھوٹے میں تمیز نہ کیا جائے- اصل ضرب المثل یہ ہے ''اندھیر نگری چوپٹ راجا، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا۔ پاس

اور آرزو کے جو مصرعے آپ نے لکھے ہیں اس میں انہوں نے خالص لغوی معنی میں ''اندھی،، کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس پر غور فرما لیا جائے۔

(۵) ''اندھا شکار،، یہ لفظ بھی بہت ہی قلیل الاستعمال ہے۔ عموماً مچھلی کے شکار کو کہتے ہیں کیونکہ شکاری کو کچھ نظر نہیں آتا کہ وہ شکار کر رہا ہے۔

کسی اور موقع پر اس کا استعمال میری نظر سے نہیں گزرا۔

یہ جو کچھ اس وقت ذہن میں آیا عرض کردیا ہے، خدا کرے صحیح ہو۔ اس سلسلے میں اگر کوئی خدمت بھی مجھ سے ہوسکی اور آپ نے اسے لایق توجہ سمجھا تو میں اپنے کو خوش نصیب سمجھوں گا۔

آگرہ — سید محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی

محبی جناب شان الحق صاحب ۔ سلام شوق

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں نے یورپ میں قیام کے دوران میں سرکاری کام کے علاوہ ان اداروں سے بھی رابطہ قائم کیا تھا جن میں اردو زبان وادب کی تعلیم ہوتی ہے۔ میں نے ان اداروں کے اساتذہ سے ملاقات کی اور اردو زبان کی تعلیم میں جو مسائل انہیں درپیش ہیں، ان کے بارے میں ان سے گفتگو کی۔ اس سلسلے میں پیرس میں اردو زبان کے استاد آندرے گمبرتیر کا ایک نوٹ عرصہ ہوا آپ کو بھیج چکا ہوں۔ اسی طرح دوسرے اداروں سے میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں انہیں میں کتابی شکل میں شایع کروں گا۔

میرا خیال ہے کہ ان اداروں سے مستقل رابطہ قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ یہ ادارے ہمارے تمدن اور زبان وادب کو دیگر قوموں سے روشناس کرانے کے لیے بہت کام کر رہے ہیں۔ ان کے اپنے مسائل ہیں جن میں سے اکثر سے ہم اچھی طرح واقف نہیں۔ اس لئے میں نے ان اداروں کے اساتذہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں وطن واپس جا کر ان سے رابطہ قائم رکھوں گا۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ ترقی اردو بورڈ کے ذریعے سے یہ رابطہ قائم رکھا جائے۔ ان کے مسائل کو سمجھا جائے اور ان کی ممکنہ مدد کی جائے۔

اس لیے میری تجویز ہے کہ ان اداروں کو دعوت دی جائے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنی کارگزاریوں سے ہمیں آگاہ کرتے رہیں۔ جن موضوعات پر تحقیق کا کام کیا جاتا ہے ان سے ہمیں باخبر رکھیں۔ اور اردو زبان و ادب کے مطالعے اور تعلیم میں جو مسائل انہیں

درپیش ہیں ان سے ہمیں آگاہ کریں۔ اس سے ہمیں یقیناً فائدہ ہوگا۔ اور ممکن ہے ہم بھی ان اداروں کی کچھ مدد کرسکیں۔ اس سلسلے میں اگر یہ ادارے ہر تیسرے یا چھٹے مہینے ایک مختصر سا نوٹ (اردو ، انگریزی یا فرانسیسی زبان میں) ارسال کرتے رہیں تو مناسب ہوگا۔ یہ نوٹ (یا ان کا ترجمہ) اردو نامہ میں شایع کیا جائے - اور غور کیا جائے کہ ہم ان کی کیا مدد کرسکتے ہیں - اس کام کی ترتیب و تدوین کے لیے میری خدمات حاضر ہیں -

''اردو نامہ،، کے شمارہ اکتوبر تا ڈسمبر سنہ ۶۳ میں شریف‌الحسن صاحب کا مضمون ''اردو کی ایک نادر مثنوی ،، شایع ہوا تھا - میں نے یہ مضمون پیرس میں دیکھا - شریف‌الحسن صاحب نے اس مضمون میں ایک مثنوی کا ذکر کیا تھا جسے مہاراجہ اپورب کشن کنور نے لکھا تھا - شریف‌الحسن صاحب نے خواہش ظاہر کی تھی کہ کسی صاحب کو اس مثنوی کا پتہ چلے تو اطلاع دیں - اتفاق سے یہ مثنوی مجھے نیپلز کے مشرقی علوم کے ادارے کے کتب خانے میں مل گئی- مضمون میں جن تفصیلات کا ذکر کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی وہی ہے جس کی شریف‌الحسن صاحب کو تلاش ہے- نسخے پر ایک جگہ لکھا ہے کہ اس میں ۱۰۰۶ اشعار ہیں -

کراچی آغا افتخار حسین

مکرمی - سلام و رحمت

''اردو نامہ'' (جنوری تا مارچ سنہ ۶۴ء) میں جناب یوسف بخاری کی گراں قدر کتاب '' یہ دلی ہے ،، پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے دلی پر لکھنے والوں کے چند معروف نام گنائے ہیں، وہ سب اپنی جگہ صحیح ہیں مگر ایک مشہور و معروف نام رہ گیا۔

جناب واحدی دھلوی مدظلہ کا نام نامی - شاید آپ کو خیال نہیں رہا کہ مولانا کے قلم سے ایک خاصی ضخیم کتاب نکل چکی ہے — ''میرے زمانے کی دلی'' -

کراچی عبدالمجید حیرت (شملوی)

برادرم حقی صاحب - ہدیۂ مسنون

'' آردو نامہ ،، کے چودھویں شمارے میں '' رسالۂ حسن '' کے متعلق محترمی جناب نصیرالدین ہاشمی صاحب کا مضمون میں نے دلچسپی سے پڑھا- موصوف نے ان تمام شماروں کی جو انہیں مل سکے، فہرست مضامین سپرد

قلم کی ہے۔ اتفاقاً میرے کتب خانے میں بھی ''رسالۂ حسن ،، کی تیسری اور چوتھی جلد کے مضامین کے تراشوں پر مشتمل ایک مجموعہ موجود ہے - میں نے ہاشمی صاحب کی فہرست مضامین سے اس کا موازنہ کیا تو ۔ چند ایسے مضامین کے تراشے مل گئے جن کا ذکر ہاشمی صاحب کی فہرست میں نہیں ہے ۔ ان مضامین کی تفصیل درج ذیل ہے ۔ اگر مناسب ہو تو کسی آئندہ شمارے میں شایع کردیجیے۔

محترم جلیل قدوائی صاحب نے سید راس مسعود مرحوم پر میرے مضمون کی جو تعریف کی ہے، وہ ان کی بزرگانہ شفقت ہے۔البتہ اس سلسلے میں صرف اس قدر گزارش ہے کہ جن امور کی طرف موصوف نے اپنے مراسلے میں توجہ دلائی ہے، وہ میرے موضوع سے متعلق نہ تھے، اس لیے جان بوجھ کر میں نے ان کا ذکر نہیں کیا ۔ مجھے ان باتوں کے علاوہ اور بھی بےشمار ایسے واقعات کا علم ہے جو حیات مسعود کا جزو لازم ہیں مگر ان کا تعلق مرحوم کی تعلیمی اور علمی سرگرمیوں سے نہیں ہے بلکہ ان کے کردار اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں ۔

رسالۂ حسن کے مضامین جن کا ذکر نصیرالدین ہاشمی صاحب کے مقالے میں نہیں ہے :

جلد (۳) نمبر (۲) فروری سنہ ۱۸۹۰ء

کتاب الہند البیرونی

سید طفیل احمد (۱)

جلد (۳) نمبر (۷) جولائی سنہ ۱۸۹۰ء

شاہ بابر غازی

نواب حبیب الرحمان خاں شیروانی

جلد (۳) نمبر (۹) ستمبر سنہ ۱۸۹۰ء

سیر و شکار

راجہ کشن پرشاد

جلد (۳) نمبر (۱۱) نومبر سنہ ۱۸۹۰ء

لکچر 'ترکوں کی گزشتہ' موجودہ اور آئندہ حالت پر، (بہ مقام لندن انجمن اسلامیہ کے سامنے ۱۲ - مارچ سنہ ۱۸۹۰ء کو دیا گیا)

محمد احمد (۲)

جلد (۴) نمبر (۱)۔ جنوری سنہ ۱۸۹۱ء

ڈاکٹر ا ۔ اِف - میکس مولر

مولوی حسن علی

---

(۱) مولوی سید طفیل احمد منگلوری مصنف ''مسلمانوں کا روشن مستقبل''

(۲) سید محمد احمد بار ایٹ لا، رئیس دہلی۔ سر سید کے قریبی عزیز تھے ۔ لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے ۔ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی اور سرگرم کارکن تھے ۔ آن کے نام کا ایک کتبہ اسٹریچی ہال میں لگا ہوا ہے اور ایک کالج کے احاطے کی دیوار میں آویزاں ہے ۔

نورجہاں — نواب عماد نواز جنگ
اسلام اور انگلستان — ایضاً
الذکور والاناث
(یعنی زمانۂ قدیم کے مردوں اور عورتوں کے تعلقات اور باہمی برتاؤ)
مجیب احمد تمنائی
جلد (۳) نمبر (۹) ستمبر سنہ ۱۸۹۱ء
مسلمانوں کی ترقی اور طبیعی اسباب کی تاثیر
سراج الدین احمد
ہندوؤں کی اصل تہذیب ۔ نواب عماد نوازجنگ
قسطنطنیہ — ایضاً
جلد (۳) نمبر (۱۱)۔ نومبر سنہ ۱۸۹۱ء
عجائبات جوف الارض، یا تحت الثریٰ ۔
نواب عماد نواز جنگ
(اس مضمون کا عنوان ہاشمی صاحب نے ''عجائبات حیوانات ارضی'' لکھا ہے)
جلد (۸) نمبر (غالباً ۱۰) اکتوبر سنہ ۱۸۹۵ء
ایک ترکی سلطانہ سے ملاقات
جمیلہ بیگم زوجہ ایڈیٹر رسالہ ' حسن '
(ٹائمس آف انڈیا مورخہ ۲۱-ستمبر ۱۸۹۵ء میں مطبوعہ انگریزی مضمون کا ترجمہ از محمد عباس)

کراچی — جمیل نقوی

مکرمی

'' اردو نامہ '' کا پندرھواں شمارہ ملا ۔ لغت کی قسط نمبر ۹ کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں ۔

مندرجۂ ذیل الفاظ یا تراکیب یا محاورے موجود نہیں :

اپینڈی سائی ٹس (Appendicitis)، میری ناقص رائے میں اس لفظ کو لغت میں شامل کر ہی لینا چاہیے ۔

اپنے تئیں (بہ‌معنی آپ کو یا اپنی ذات کو) اسے '' اپنے تئیں کھینچنا '' سے پہلے درج ہونا چاہیے۔ سند : (اپنے تئیں نیست و نابود سمجھ کر دل کو اس غفلت دنیوی سے ہشیار رکھے۔ باغ و بہار۔ ص ۱۰ ترقی اردو بورڈ ایڈیشن)

اپنے کئے کا علاج نہیں (خود کردہ را علاجے نیست کی اردو شکل ہے)۔

اپیل ڈگری ہونا (بہ‌معنی اپیل منظور ہونا)

اس کے علاوہ کیا اپیل خاص، اپیل سرسری (Summary)، اپیل عام (Regular) اور اپیل متخالف (Cross) کو لغت میں جگہ ملنی چاہیے؟

اپولو یا اپالو۔ سند بھی موجود ہے آپ کے جوش صاحب کی :

" وہ اپولو کے کلیجے کو مسلتی مان سون "

اپریٹس یا اپیریٹس۔ (Apparatus) اس قسم کے الفاظ کا ابھی سے فیصلہ کرلیجیے کہ یہ کہاں درج ہوں گے، اپ میں یا ای میں؟

"اپنے کو" کے بارے میں درج ہے کہ "لکھنؤ میں اس موقع پر آپ کو بولتے ہیں" اور ایک سند طلسم ہوش ربا سے دی گئی ہے جو خاص لکھنؤ کی تصنیف ہے۔ کیا اس نوٹ میں لفظ "بالعموم" بڑھا دینا مناسب نہ ہوگا؟

مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی گزشتہ شمارے میں "اپریل فول" کی تشریح کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ رسم عیسائیوں کی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ رسم انگریزوں کی ہے اور اسے تمام عیسائیوں سے منسوب کرنا درست نہ ہوگا۔ آپ اس بارے میں اپنا اطمینان کرلیں۔

لاہور — محمد سلیم الرحمن

ان سب مشوروں پر غور کیا جا رہا ہے اور شکریہ ان کا بہر حال واجب ہے۔ ش۔ ح۔ ح

مکرمی۔ السلام علیکم

نگار (پاکستان) بابت ماہ جنوری سنہ ۶۴ء کے ملاحظات کے صفحات پر جناب نیاز فتحپوری صاحب نے "ادارہ ترقیٔ اردو بورڈ" کے بارے میں اپنے خیالات سپرد قلم کئے ہیں، جو میری نظر سے بھی گزرے۔ ان کی تحریر کردہ باتوں سے اس بات کا علم ہوا کہ ادارہ ایک 'جامع اردو لغت' کی تالیف میں نہایت ہی تحقیق و تدقیق کے ساتھ مصروف ہے۔ انہیں سطروں میں جناب نیاز صاحب نے لکھا ہے کہ لغت کے چند صفحات بطور نمونہ بہ غرض طلب رائے اردو نامہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ میرے دل میں اردو نامہ کے ذریعے ترقیٔ اردو بورڈ کے کارنامے کو دیکھنے کی لگن پیدا ہوئی۔

میں نے اردو نامہ کا چودھواں شمارہ بابت اکتوبر تا دسمبر ۶۳ء کا مطالعہ کیا۔ دیگر مضامین و نوادرات کو چھوڑ کر اردو لغت میں خاص طور پر دلچسپی لی ہے اور کہ سکتا ہوں کہ ادارے کی جستجو اور محنت واقعی تعریف کے قابل ہے۔ جہاں امثال واقوال کے ثبوت میں اساتذہ کے اشعار اور مصرعوں سے کام لیا گیا ہے، وہیں اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ مستند اهل قلم کی تحریروں کے تاریخی نمونوں کے حوالے بہم پہنچائے جائیں۔ اس کے ذریعے محققین نہ صرف زبان کے ارتقا کی تاریخ متعین کرسکتے ہیں بلکہ اس بات کا پتہ بھی چلایا جا سکتا ہے کہ کون کون سے الفاظ و محاورات کس دور میں کس طرح سے رائج تھے اور آج ان کی ہیئت میں کیا تبدیلی رونما ہوئی ہے۔

دوسری خوبی جو پہلی ہی نظر میں ظاہر ہوجاتی ہے وہ ہے، ٹائپ کا استعمال۔ ادارے نے اردو کے جس ٹائپ کو منتخب کیا ہے وہ واقعی اردو ٹائپ کے مقابلے میں زیادہ نستعلیق ہے۔ لیکن ایک چیز جو بہت زیادہ کھٹکتی ہے وہ ہے ۱۲ پائنٹ، جیسے ''بحوالہ فسانہ'' وغیرہم کی (ہ)۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ کوشش کرکے اسے تبدیل کروادیتے۔

میں کبھی اس بات کی جسارت نہ کرتا کہ آپ کو خط لکھوں، اگر میں ''اردو نامہ'' میں بورڈ کی طرف سے شائع شدہ اعلان نہ پڑھتا۔ دوسرے اگر مجھے اس چیز کا علم نہ ہوتا کہ اردو میں بڑے پیمانے پر ایک لغت کی تدوین کی جا رہی ہے۔ تیسرے اگر لغت بجائے ٹائپ کے کتابت کے طریقے پر شایع کی جاتی۔ انہیں تمام باتوں کی وجہ سے اس کی ہمت کر رہا ہوں کہ حالیہ شمارے میں شامل شدہ اردو لغت کی قسط نمبر ۸ سے وابستہ ٹائپ کی اغلاط کو بورڈ کے علم میں لاؤں تاکہ اشاعت کے وقت ان کو دور کیا جا سکے۔

میری نظر میں پروف ریڈنگ کا کام نہایت ہی مشکل کام ہے۔ پروف ریڈر کو جہاں صحیح یا غلط پر نظر رکھنی ہوتی ہے، وہیں ایک ایک نقطے، ایک ایک جوڑ کو بار بار پرکھنا پڑتا ہے کہ آیا یہ صحیح حرف ہے یا غلط۔ اور ایک لحاظ سے کسی کتاب کی غلطیوں کی ساری ذمے داری پروف ریڈر ہی پر ہوتی ہے۔ میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ آپ کو ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطے کی غلطی سے آگاہ کروں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ اسے قبول فرمائیں یا رد کردیں۔ میں تو اعلان کے مطابق اطمینان کا سانس لوں گا۔

قطب محی الدین، منشی

[جناب مراسلہ نگار نے ٹائپ کی اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔ ہم ان کی اس کاوش کی داد دیتے ہیں اور نہایت شکر گزار ہیں۔

انشاء اللہ اصل کتاب کا ٹائپ بھی اس سے بہتر ہوگا اور غلطیوں کی صحت میں بھی خاص احتیاط کی جائے گی۔ ش - ح - ح]

مکرمی! اکبر مرحوم نے اپنے ظریفانہ کلام میں پولیس کے الفاظ رپٹ، تھانہ، ڈائری، پریڈ، اور خفیہ پولیس وغیرہ استعمال فرمائے ہیں۔ اکبر مرحوم کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال
خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

احتمال فتنہ ہے ہر مجمع ملت کے ساتھ
گشت کرتی ہے پولیس بھی شیخ کی جنت کے ساتھ

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے
ایک ہیں خفیہ پولیس میں ایک پھانسی پا گئے

ڈائری میں ہو گیا تھا اختلاف اندراج
لڑ گئے خفیہ پولیس سے کل کراماً کاتبین

دست اندازی پولیس کی ہو جس میں روا
ہرگز نہ اسے کلام اکبر سمجھو

تعلیم اس کی اچھی جو گھر میں اپنے خوش ہو
مذہب اسی کا بہتر جس کو پولیس نہ پکڑے

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے
گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے
صرف تعویذ اور گنڈا ہے

کیا ہے باقی جناب قبلہ میں
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے

سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبط پولیس
ہے زباں گرم قلب ٹھنڈا ہے

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی
لیلی و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

پولیس خفیہ ہے ، انسداد جرم ہے ٹھیک
نہ چاہیے کہ ہو وہ انسداد گپ کے لیے

لے ہی گئے گھسیٹ کے مجھ کو پریڈ پر
تیار ہو رہا تھا میں جنت کے واسطے

کیا گزری جو اک پردے کے عدو رو رو کے پولس
سے کہتے تھے
عزت بھی گئی ، دولت بھی گئی ، بی بی بھی گئی
زیور بھی گیا

خیرپور		اختر حسن۔

مکرمی ۔ السلام علیکم

اردو لغت کی قسط نمبر ۸ و نمبر ۹ نظر افروز ہوئی۔ جس تحقیق و تدقیق سے یہ کتاب اپنی تالیف کے مراحل طے کر رہی ہے اس میں کہیں نقطہ لگانے کی گنجائش کہاں؟ تاہم چونکہ رائے زنی اور مشورہ دہی کا اذن عام ہے ، اس لئے چند شعر اور کچھ معروضے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں ۔ امید ہے کہ نظائری مواقع کے لئے اشعار اپنی جگہ کارآمد ثابت ہوں گے اور گزارشات مفید مشورہ کا درجہ حاصل کرلیں گی :

[متعلق قسط نمبر ۸ صفحہ ۱۳۳ و ۱۳۹]

اپنی چھاتی پر ہاتھ دھرنا :
رکھ نہ سینہ پہ اس کے کوہِ فراق
اپنی چھاتی پہ ہاتھ دھر شیریں

(نکہت) خزینتہ الامثال صفحہ ۱۰

اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے :
گلی میں اپنی تو ہوتا ہے شیر کتا بھی
سگِ ہوس کا ہے سینے میں صید ضیغم دل

خزینتہ الامثال ص ۹۱ ، شاہ نصیر سنہ ۱۲۵۴ ھ

[متعلق قسط نمبر۹ صفحہ ۱۴۷ تا ۱۵۰]

اپنے پیر میں کلہاڑی مارنا:

دین گنوایو دنی سے دنی نہ آئی ہاتھ
پیر ''کہاڑی'' (۱) ماریو گا پھل اپنے
ہاتھ کبیر داس سنہ ۱۳۰۲ء قصص الامثال ص ۳۰

اپنے حق میں کانٹے بونا:

ہمیشہ چاہتے ہیں چھیڑ اس کافر کی مژگاں سے
یہ کانٹے حضرتِ دل آپ اپنے حق میں بوتے ہیں
شاہ ظفر ص ۱۸۳۰ء ص ۳۰ قصص الامثال

یہ تو تھے وہ اشعار جو الفاظ کی نظائر میں اضافے کا باعث ثابت ہوسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں چند غور طلب باتیں درج ذیل ہیں:

قسط نمبر ۹ کے صفحہ ۱۵۰ پر ایک محاورہ درج ہے:

اپنے حلوے مانڈے سے کام

اس محاورے کی سند میں کوئی فقرہ یا شعر ایسا پیش نہیں کیا گیا کہ جس میں یہ جملہ آتا ہو۔ بجائے اس کے 'مردہ جنت میں جائے'' کی سند میں ضرب المثل لائی گئی ہے اگر یہ محاورہ ہے تو ثبوت چاہیے اور اگر کہاوت کا آخری ٹکڑا کہا جاتا ہے تو سب جانتے ہیں کہ ضرب المثل، محاورہ یا اصطلاح میں کسی قسم کا تصرف ناجائز ہے، پھر ایسا کیوں؟

ایک اور محاورہ آگے چل کر آتا ہے:

اپنے پوت کنوارے پھریں پڑوسن کے پھیرے

اس کی ایک توضیح یہ بھی درج کی گئی ہے کہ: ''لڑکوں کا بیاہ نہ ہوگا تو ہمسائے میں تاک جھانک کریں گے''۔

اس مطلب کے ثبوت میں نہ تو کوئی شعر ہے اور نہ کوئی جملہ۔ خیر نہ سہی، لیکن وہ کونسے الفاظ ہیں جو مفہوم بیان کردہ کا پتہ دیتے ہیں؟ میرے ناقص خیال میں تو اس ضرب المثل کا صرف یہی مطلب آتا ہے کہ:

''اپنے کنوارے لڑکوں کا تو کوئی فکر نہیں، غم ہے تو پڑوسن کے پھیروں یعنی شادی کا۔'' یہ ایک طنز ہے۔ اپنوں کو نظر انداز کرکے دوسروں کے غم ناحق میں گھلنے والوں پر جو کہاوت کا ایک خاص مزاج کہا جاسکتا ہے۔

کراچی ذاکر

(۱) اس سند میں '' کلہاڑی '' کا لفظ نہیں ہے (ادارہ)

مکرمی و محبی

آپ کا افتتاحیہ پڑھا جس میں آپ نے ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی کے خطبۂ صدارت پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔

خطبے کی سطحیت اور ادبی، لسانی اور تعلیمی مسائل سے ڈاکٹر صاحب کی ناواقفیت کو آپ نے بڑے دل نشیں طریقے سے واضح کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا خطبہ پڑھ کر قارئین کے دل میں (ناواقفوں سے بحث نہیں) برھمی اور آزردگی کا جوش اٹھے گا' لیکن آپ نے جس ٹھنڈے دل سے اور دھیمے انداز سے ڈاکٹر صاحب کے نظریات کی قرار واقعی تردید کی ہے وہ ہر طرح لایق تحسین ہے۔ آپ کی پوری تحریر میں کہیں تلخی کا نام نہیں اور منطقیانہ استدلال کی فراوانی ہے۔ میں اس کامیاب افتتاحیہ پر آپ کو تہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔ آپ نے بروقت توجہ کی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی مغالطہ انگیزیوں کا ازالہ از بس ضروری تھا۔

اخلاص مند،

ڈھاکہ   عندلیب شادانی

عزیزالقدر

... وارث سرھندی صاحب اپنی کملی میں مست ہونے کی سند طلب کرتے ھیں۔ یہ سند کا مسئلہ بھی خوب ہے۔ شاہ نصیر کے ایما سے ان کے شاگردوں نے ذوق کو چیلنج کیا تھا کہ اس زمین میں ایک غزل کہہ دیں تو استاد مان لیں۔ انھوں نے دو غزلہ کہہ دیا، پھر بھی وہ بعض اشعار کی سند مانگنے لگے۔ آپ نے جواب دیا کہ ایک کی جگہ دو غزلیں ہوگئیں پھر بھی سند کی ضرورت باقی رہی۔ صاحب لغت کا اتنا تو اعتبار چاہیے۔ تاھم مجھے اندر سبھا، امانت کا شعر یاد آگیا۔ سبز پری پرستان سے نکالے جانے کے بعد جوگن کے بھیس میں پھر پہنچتی ہے اور سبھا میں بارپاتی ہے؛ تو راجا خوش ہوکر انعام میں رومال دیتا ہے وہ یہ کہ کے انکار کردیتی ہے:

"رومال ان کو دیجئے جو تنگ دست ھیں۔ فقیر اپنی کملی ھی میں مست ھیں۔"

محاورہ دراصل ہے "کملی میں مست ہونا"، کملی میں مگن ہونا اس کی دوسری شکل ہے جو مولانا حالی نے ضرورت شعری سے استعمال کی۔

لندن   شمس الاسلام

(ھم مولوی شمس الاسلام صاحب کی توجہ کے ممنون ھیں۔ یہ مثال ھمارے ذخیرۂ اسناد میں موجود تھی مگر "کملی" کے تحت۔ اسی طرح کے تعاون سے اس اھم کام کی تکمیل ہوسکے گی۔ ش - ح - ح)

تبصرے

ش - ح - ح

چند نئے شعری مجموعے

مدیر مخزن کے نام اقبال کا یہ پیغام :

''جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے''

اب سے دور اس دور محکوسی میں کہ گویا ایک طویل بحران تھا، شاید عجیب نہ معلوم ہو مگر لیکن حقیقت میں بڑا تامل چاہتا ہے ۔ تاریخ و عمرانیات سے اس کی تائید نہیں ہوتی ۔ نہ معلوم علامہ اقبال کے پیش نظر، سوائے دیسی مہاجنوں کے، وہ کون سی قومیں تھیں جنھوں نے شاعری یا فی الجملہ فنون لطیفہ کو اپنے کاروبار کے پیچھے بالکل ہی تیاگ دیا ہو اور مذاق سخن سے عاری ہوگئی ہوں ۔ یہ الزام شاعری کے سر ناحق لگ گیا ہے کہ عمل کی نسبت بے عملی سے اور ترقی کی نسبت پستی سے علاقہ رکھتی ہے ۔ قوموں میں قوت حیات اور زور تخلیق اگر موجود ہو تو ان کا میدان عمل محدود نہیں ہوتا بلکہ پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے ۔

یہ بات البتہ عجیب ہے کہ ہماری شاعری کو فروغ ہماری سیاسی پستی کے دور میں ہوا ۔ یا یوں کہیے کہ ابھی ہم نے اپنی شاعری کے وہی دور دیکھے ہیں ۔ پھر بھی ملتی تحریک کو فروغ دینے اور قوم کو جگانے اور ابھارنے میں اردو شاعری اور خود علامہ اقبال کی حیات بخش شاعری کا جو دخل رہا ہے، محتاج اظہار نہیں ۔ ہماری قومی و ملی شاعری کے دفتر اس بات پر شاہد ہیں کہ آزادی کی مہم میں مجاہد کے خون کے ساتھ شاعر کا خون جگر بھی شامل تھا ۔ یہ ہمارے شاعر ہی تھے جو ہماری غلامی کے زمانے میں ہماری قومی برائیوں کو یاد دلاتے رہے اور نصب العین سے غافل نہ ہونے دیا ۔ بیرونی غلبے کے مقابلے میں ہماری خود داری و خود اعتمادی کو قائم رکھنے میں ہمارے شاعروں نے جو کام کیا ہے بھلایا نہیں جا سکتا ۔ اردو شاعروں نے قومی مسائل پر جس جذبے کے ساتھ جتنی فراواں اور جس پائے کی شاعری پیدا کی اس کی مثال نہیں مل سکتی ۔ آزادی کے بعد جو شاعری پیدا

ہوئی ہے اس کی بابت مستقبل کا فیصلہ معلوم نہیں کیا ہوگا، لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ اس میں زندگی کے مسائل کا شعور یا چرچا پہلے سے کچھ کم نہیں، نہ رفتار تخلیق میں کوئی کمی آئی ہے - ۴۷ء سے اب تک جو شاعری پیدا ہوئی اسے تھوڑا نہ کہا جائے گا، اس میں چند بہت اچھے مجموعے بھی شامل ہیں - سولہا برس میں چند کو بھی توقع سے دو چند سمجھنا چاہیے - ہمارے ملک میں تعلیم پہلے ہی کم ہے، اور اسی حساب سے ادب کی مانگ بھی۔ جو چند صاحب قلم ہیں ان کے ذہنوں پر اور بہت سے تقاضے سوار رہتے ہیں - کون ہے جو کثرت افکار میں گرفتار اور قلت وقت کا شاکی نہ ہو ؟

گزشتہ چند ہی مہینے میں ہمارے ہاتھوں میں جو شعری مجموعے آئے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے شاعری پر ''جمود'' کا الزام درست نہیں معلوم ہوتا۔ یہ نہ صرف ادب بلکہ قوم کے حق میں بھی مبارک فال ہے - یہ تخلیقات ہمارے دامن میں نہ ہوں تو صرف تعمیرات سے قوم کا سر افتخار بلند نہیں ہوسکتا - اس وقت ہمارے سامنے نظموں کی چھ کتابیں ہیں جو آٹھ شاعروں نے لکھی ہیں۔ یہاں ان پر مفصل تبصرہ تو ممکن نہیں لیکن مختصرتعارف پیش کیا جاتا ہے :

تین کتابیں از محبوب خزاں، محب عارفی و قمر جمیل

مکتبۂ آسی کراچی ۷ - قیمت ۲۵۰ روپے

یہ تین کتابیں ہم جلد ہیں، جن میں محبوب خزاں کی ''اکیلی بستیاں'' (۸۴صفحات) محب عارفی کی '' گل آگہی '' (۸۲ صفحات) اور قمر جمیل کی ''خواب نما'' (۹٦ صفحات) شامل ہیں - گویا یہ تین کتابیں مشترک بھی ہیں متفرق بھی - ان کی یک جائی ایک دلچسپ جدت ہونے کے علاوہ فائدے سے خالی نہیں - یعنی تقابلی مطالعے کا موقع ملتا ہے - ملک میں ادب کے خریداروں کا کال ہے اور ناشروں کے وسائل محدود - ان تینوں شاعروں نے مل کر زمانے کی ناقدری پر اپنے حسن تدبیر سے پردہ ڈال دیا ہے - ڈھائی روپے میں تین، ٹکے سیر نہ سہی، پھر بھی سستا سودا ہے -

محبوب خزاں کی نظموں کا مزاج گیتوں کا سا ہے - چھوٹے چھوٹے جذباتی تجربے اکھڑے اکھڑے، دھیمے دھیمے، لہجے میں - کہیں کوئی شدت، کوئی برھمی یا شوریدگی نہیں،

کوئی قیامت نہیں مچتی :

بیکس چمیلی پھولے اکیلی آھیں بھرے دل جلی
بھوری پہاڑی خاکی فصلیں دھانی کبھی سانولی

اسی لہجے میں انہوں نے اپنے دل کی بہت سی باتیں کہی ہیں۔ وہ حسن اور محبت کے موضوع سے بھٹکتے تو ضرور ہیں لیکن چند قدم سے زیادہ نہیں۔ گیت ادب سے زیادہ موسیقی کے زیر فرمان ہوتا ہے۔ لہذا اس پر عروض و بیان کی گرفت زیادہ کڑی نہیں ہوتی۔ محبوب خزاں نے گیت تو نہیں لکھے، نظمیں ہی لکھی ہیں لیکن ان میں خاصی ہنرمندی سے گیتوں کا سا رنگ پیدا کیا ہے، اور اسی کے سہارے اپنے خیال اور اظہار کی آزادی کو نباھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مصرعوں یا بولوں میں اٹکھیلی کا سا انداز ہے۔ کہیں صاف کہیں مبہم کہیں سنجیدہ کہیں لغزیدہ ("کہ جیسے راہ میں بچے خوشی سے کھیلتے ہیں" ۔ خزاں)۔ وہ ہمارے نوجوان شعراء میں ہیں، جن کی منزل طویل ہے اور اسی لحاظ سے امکانات بھی طویل کہے جاسکتے ہیں۔ بقول ان کے :

گھبرا نہ ستم سے نہ کرم سے نہ ادا سے   ہر موڑ یہاں راہ دکھانے کے لئے ہے

ہم نئے ادبی تجربات کو سراھنے کے قائل ہیں۔ اسی سے نئی ترقی کی راہیں کھلیں گی۔ "اکیلی بستیاں" اور "چاند کے مسافر" اس مجموعے کی بہتر نظمیں ہیں۔ "غزلیات" کے حصے میں کہیں کہیں سادہ پُرکاری کے نمونے ملتے ہیں :

ناز و انداز دل دکھانے لگے   اب وہ فتنے سمجھ میں آنے لگے
پھر وھی انتظار کی زنجیر   رات آئی دیے جلانے لگے
منزل صبح آگئی شاید   راستے ہر طرف کو جانے لگے

محب عارفی خزاں سے زیادہ کہنہ مشق ہیں۔ ان کے مجموعے میں انفرادیت اتنی نمایاں نہیں، لیکن نظر زیادہ وسیع، موضوع نسبتاً زیادہ متنوع اور سانس بھی زیادہ ہے۔ یعنی صرف چند بولوں سے اظہار کا حق ادا نہیں ہوجاتا، الفاظ زیادہ وافر اور تخیل جراُت آمیز ہے۔

دوزخ سے بھی بدتر ہے یہ عالم کاف و نون   انسانوں کی بستی اس میں جنگل کا قانون
تن اور من کی دو دنیائیں دونوں پُرآزار   تن کی دنیا من پر بھاری من سے تن بیزار

مشیت کو منظور تھا دیکھنا   تماشائے تمثیل مرگ و فنا
شقاوت کے فتنے ہلاکت کے جال   درید و برید و جدال و قتال
تڑپنے کلپنے بلکنے کے رنگ   لہو میں نہائی نمو کی امنگ
مناظر یہ ذہنوں میں آئے معاً   زہے زور تخیئل ارباب فن (الخ)

(بزبان یزید)

ناخن تدبیر سے میرے یہ عقدہ کھلا   فسق ہے عین حیات صدق فقط فلسفہ
کوثر و تسنیم سے بجھ نہیں سکتی وہ آگ   جس کی حرارت سے ہیں رقص میں ارض و سما
حکم قضا سے وہ تیغ کند نہ ہوگی کبھی   جس کی شریعت میں ہو خون شرافت روا
میرے عمل سے رہا سارے زمانے کو رنج   نقش قدم پر مرے سارا زمانہ چلا
اٹھتے رہیں گے غبار بڑھتے رہیں گے سوار   مرد کو ہے گرد راہ فتنۂ صدق و صفا

ایک جگہ لکھتے ہیں :

دنیا سے رخصت ہوچکی ابہام کی رسم کہن
توضیح کے اس دور نے چھوڑا کنایوں کا چلن

یہ بات انہوں نے " نئے تقاضے " کے زیر عنوان، ایک نوخیز لڑکی سے بظاہر " ٹیڈی لباس " کی بابت کہلوائی ہے۔ لیکن یہ کلیہ ادب کے میدان میں غلط ٹھہرے گا۔ البتہ ان کا اپنا کلام ابہام سے پاک ہے ۔ غزلوں کے حصے میں بھی خوش فکری اور خوش آہنگی پائی جاتی ہے :

کیسے کیسے ملے دن کو سائے ہمیں   رات نے بھید سارے بتائے ہمیں
راز ہستی تو کیا کھل سکے گا کبھی   مل گئے تھے مگر کچھ کنائے ہمیں

کہیں کہیں عروضی کھینچ تان بھی ہے ، جو گیتوں کی طرح نظم یا غزل کو سازگار نہیں ہوتی :

گہری نیند سے چونکایا ہے مجھ کو مری بیماری نے
غنودگی سے جنم لیا ہے شعور کی ناچاری نے

بحر متقارب میں بڑی سمائی ہے' مگر یہاں بڑے غیر معمولی زحاف لائے گئے ہیں ۔

قمر جمیل کے مجموعے میں سابقہ دونوں مجموعوں کی کچھ اقدار مشترک ہیں۔ مگر ان کی آواز زیادہ جان دار ہے۔ حسن تاثیر کے لئے بلند آواز کی شرط نہیں، لیکن یہ خلوص اور خوش آہنگی کے ساتھ ہو تو بے تاثیر نہیں ہوتی۔ برنارڈشا نے ایک نوجوان شاعر کی زبان سے کہلوایا تھا:

"اب میری عمر دنیا کے برابر ہے۔ صبح تک میں ۱۸ سال کا تھا۔"

گویا شاعری وقت سے آزاد ہوتی ہے اور شاعر کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ لیکن قمر جمیل کا کلام ان کی اپنی عمر اور اپنے دور ہی کا کلام ہے۔ وہ جوان سال اور جوان فکر آدمی ہیں، گرد و پیش کو ایک والہانہ نظر سے دیکھتے ہیں، مفکرانہ یا ہادی و منادی کی نظر سے نہیں، اس میں ان کو دکھ اور درد بھی نظر آتے ہیں حسن و جوانی بھی، اور یہی ان کے نغمات کے محرکات ہیں۔ مگر بات ذوق گفتار سے آگے نہیں جاتی۔ محب عارفی کا کلام ایک پختہ روش اور خاص منزل پر ہے۔ خزاں اور جمیل کے ہاں کسی نایافتہ منزل کا کھوج اور نئی طلب کی بے چینی بھی محسوس ہوتی ہے:

باد صبا لے چلی ایک نئے شہر میں
اور مرا قافلہ چل نہ سکا میرے ساتھ
شہر کی گلیاں نہ تھیں پاؤں کی زنجیر تھی
اور مرا شوق تنہا رشتہ بہ پا میرے ساتھ
ایک بگولا کہ ہے جس میں بہت پیچ و تاب
عمر رواں کی طرح آج بھی تنہا میرے ساتھ
عمر رواں لے گئی میرا سکوں چھین کر
اور مرے صبر کو چھوڑ دیا میرے ساتھ

یہ غزل کے شعر ہیں، جن میں غزلیت کے ساتھ ساتھ نیاپن اور نئی امنگ نمایاں ہے، اور روایت کا رشتہ بھی ڈھیلا نہیں ہونے پاتا:

ہم ستاروں کی طرح ڈوب گئے
دن قیامت کے انتظار میں ہے
ہزار قافلے دل میں اتر چکے پھر بھی
یہ مصر یوسف کنعاں کے انتظار میں ہے
تیری طلب تیرا جنوں تیرا غم
میری طرح عالم ہجراں میں ہے
میں ہی نہیں اپنی فغاں کا سبب
تو بھی میرے سینۂ سوزاں میں ہے
میں نے کہا میرے لئے کچھ سکوں
اب بھی تری زلف پریشاں میں ہے؟
اس نے کہا تیرے جنوں کے لئے
کام بہت شہر و بیاباں میں ہے

شہر نوا از محشر بدایونی

مکتبہ ماحول، کراچی ۱۴۴ صفحات
قیمت ۳۶۰۰ روپے

فاروق محشر بدایونی اپنی مشہور نظم ''تاج محل،، اور مقبول مشاعرہ غزلوں کی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے شاعروں کا ایک منظوم تذکرہ ''شاعر نامہ،، کے نام سے بچوں کے لئے مرتب کیا تھا جس پر انجمن ترقیٔ اردو نے ایک ہزار روپے کا انعام دیا۔ '' شہر نوا،، ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے جسے انہوں نے بڑے ذوق و شوق سے ہدیۂ ادب کیا ہے :

پابہ‌جولاں عرصۂ سرو وصبا میں آئے ہیں ہم بھی کچھ نغمے لئے شہر نوا میں آئے ہیں

مگر اس شعر کے علاوہ مجموعے میں اور کسی جگہ زنجیر کی جھنکار سنائی نہیں دیتی۔ یہ مجموعہ زیادہ‌تر پچھلے تین چار سال کی غزلوں پر مشتمل ہے اور آخر میں کچھ '' پہلے دور ،، کی غزلیں بھی درج کردی گئی ہیں ، پچھلے چند سال میں لہجے ، مذاق اور معنویت کے لحاظ سے غزل نے ایک نئی منزل طے کی ہے ۔ اس کا اثر عوام و خواص کے مذاق پر بڑا نمایاں ہے اور اس کا ثبوت کہنہ مشق شاعروں کے ان مختصر مجموعوں کی مختصر غزلوں سے بھی ملتا ہے ، جن میں ظاہرا بڑی کاٹ چھانٹ کی گئی ہے۔

اس طرح مجموعے کے دونوں دوروں کا کلام کچھ اتنا ہم رنگ ہوگیا ہے کہ یہ تقسیم غیر ضروری نظر آتی ہے-اس سے شاعر کی ذہنی اور فنی ترقی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے ۔ لیکن اس منتخب مجموعے میں غزل کے بعض بڑے اچھے نمونے شامل ہیں ، اور کچھ ایسے شعر بھی جنہیں جدید اردو غزل کے انتخاب میں رکھنا چاہئے ۔ دیکھئے وارفتگان عشق کی سرمستی کا کس افسانوی اور ڈرامائی پیرائے میں اظہار ہوا ہے :

ہم خس و خاشاک آوارہ گزرگاہوں کا بوجھ رقص کرنے تیرے کوچے کی ہوا میں آئے ہیں

محشر کا کلام عموماً منجھا ہوا سلیس اور پُر معنی ہے :

صبر کر اے دل حزیں دیکھ یہ اہتمام شب ماہ و نجوم و کہکشاں یونہی نہیں ہیں بےسبب
میری نظر نہ اٹھ سکی میری نظر کا کیاقصور حسن‌ہزار شوخ ہو عشق نہیں ہے بے ادب

محبت کے گلستانوں میں پھلنے پھولنے والو اسی رستے میں آگے حل کے ویرانے بھی آتے ہیں
سبھی صحن چمن میں پھول چننے کو نہیں آتے کچھ اپنے دامنوں میں خار الجھانے بھی آتے ہیں

انہوں نے چھوٹی بڑی زمینوں میں اسی انداز کو نباہا ہے :

هم‌نفسو کیا بیر آپس میں ہم بھی قفس میں تم بھی قفس میں
بھونرا اپنی سوچ میں گونجا کیا رکھا تھا پھول کے رس میں

دن بہت گزرے رفیقو گھر چلو سوچتے ہوں گے درو دیوار کیا
ہم تو قصہ کہتے کہتے تھک گئے چپ ہو گئے اب ہماری داستانیں لوگ دہرایا کریں

لیکن ابھی محشر صاحب کے چپ ہونے کا وقت نہیں ، لب کشائی کا وقت آیا ہے ۔ اردو غزل کو ان سے ایسے ہی بہت سے جواہر کی توقع ہے ' ہر چند کہ ساڑھے تین روپے ڈھیری کے حساب سے بکیں ۔

کتاب کی طباعت اور ظاہری تزئین بھی اچھی ہے ۔

کلک موج از عبدالعزیز خالد

دوآبہ کوآپریٹیو پبلشرز لمیٹڈ، کراچی

۲۶۳ صفحات، قیمت ۷ روپے ۵۰ پیسے

عبدالعزیز خالد اپنے معاصرین میں سب سے پُرگو ہیں۔ پچھلے چند برس میں ان کی دس بارہ کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں کچھ منظوم تراجم بھی ہیں۔ بعض کو ایک سے زیادہ ایڈیشن بھی نصیب ہوئے ۔ ان کے اس زور طبیعت کے علاوہ ان کا کلام الفاظ کی فراوانی، ترکیبوں کی جدت اور الفاظ کے اچھوتے پن کی بنا پر قابل قدر ہے۔ بعض کنوارے الفاظ کو انہی نے شرف مشرف کیا ہے ۔ اور دوسری زبانوں کی لغتوں سے بھی اکتساب کا دروازہ کھلا رکھا ہے ۔ وہ تلمیحات میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اس تازہ مجموعے سے یہ بات اور بھی مستحکم ہوجاتی ہے کہ اس خاص صنف میں ان کا قدم ہر شاعر سے آگے ہے ۔

یہ سچ ہے کہ عربی و فارسی ہماری ثقافت کا جزو لازم ہیں ۔ عربی و فارسی لغت کا ہر لفظ گویا ہماری میراث اور ہمارا ہی مال ہے ۔ یہ بھی سچ ہے کہ اردو زبان کی حدود

وسیع بھی ہیں اور ابھی تک غیر معین بھی۔ جب تک ترقیٔ اردو بورڈ کی تاریخ وار لغت مرتب نہ ہوجائے یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سا غریب لفظ جو کسی نے برتا پہلے نہیں بندھ چکا تھا اور بار بار نہیں بندھ چکا تھا۔ اسی طرح ایک بین الاقوامی ادبی حلقہ بھی ہے جس سے ہمیں ذہنی تعلق ہے اور ہونا چاہیے۔ اس لیے عبدالعزیز خالد کا عربی، فارسی، ترکی، فرانسیسی، جرمن، یونانی، لاطینی وغیرہ کے ادب سے اقتباس یا تلمیح کرنا پورا پورا جواز رکھتا ہے۔ بلکہ اس سے ان کی شاعری کا پایہ بلند اور اس میں دلچسپی کا ایک پہلو بڑھ جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ الفاظ غریبہ اور تلمیحات کی ایسی کثرت جیسی کہ زیر نظر مجموعے میں پائی جاتی ہے کہ کم ہی شعر اس سے خالی ہیں، آورد کا شدید شائبہ پیدا کرتی ہے، اور تاثیر کلام کے حق میں مفید نہیں۔ ایسے کلام کو ذوق سلیم ادق کہتا ہے اور برحق نہیں سمجھتا۔

رزق مقسوم ہے اجل مختوم پی شراب معتق و مختوم

ایسے اشعار غیر اردو نہ سہی غیر ادب بن جاتے ہیں۔ بہرحال خالد کی وسعت نظر، وسعت مطالعہ اور اس محنت کا اعتراف واجب ہے جو انہوں نے اتنی تلمیحات کو یکجا کرنے اور ناواقفوں کی ہدایت کے لئے ان پر حاشیے لکھنے میں اٹھائی ہے۔ ان میں اعلیٰ شاعری کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ کلام سے ذہنی وسعت کے ساتھ گداز طبیعت کا بھی پتہ چلتا ہے، اور زور طبیعت کا یہ حال ہے کہ تلمیح کے علاوہ صنعت تلمیع کی بھی خوب خوب داد دی ہے۔ عربی و فارسی پر ایسی قدرت اس دور بے توفیقی میں جسے بھی نصیب ہو غنیمت ہے۔ بقول خالد:

شعر حکمت کا ہے شعبہ اور حکمت مرد مومن کی متاع گم‌شدہ ہے

وہ اپنے انداز اور اپنے کمال میں ایک ہیں اور ان کو اپنی اسی روش پر اصرار ہے:

ہم کو نہیں مانع نوا سنجی یار سخن فہم کی طرف داری
چل رہ تخلیق میں پیادہ پا تادم آخر سفر رہے جاری

الف از رئیس امروہوی

ادارۂ ذہن جدید کراچی، ۱۹۲ صفحات، قیمت ٥ روپے

''میں پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں پیدا ہوا، دوسری جنگ عظیم میں میری شاعری پروان چڑھی اور تیسری جنگ عظیم ......؟''

رئیس امروہوی نے کتاب کے ''یک حرفی'' نام کے ساتھ اسی ''دو حرفی'' مقدمے پر اکتفا کی ہے اور گویا ان تکلفات پر تین حرف بھیج دئیے ہیں۔ مگر مجموعے میں بہت کچھ کہا ہے اور کھل کر کہا ہے۔ کلام میں جوش اظہار، قدرت اظہار اور خلوص اظہار تینوں چیزوں کا پتا چلتا ہے، جن سے عمدہ شاعری تشکیل پاتی ہے۔ ابتدا میں غزلیں ہیں جن میں ایک نئے انداز کو پانے اور نبھانے کی کوشش اول اول خاصا چونکاتی ہے:

گرد میں اٹ رہے ہیں احساسات — دھیمے دھیمے برس رہی ہے رات
جل اٹھا اک چراغ شام تو کیا — بجھ گئے بے شمار امکانات
ہائے ماضی کی دلنشیں یادیں — ہائے خونخوار بھیڑیوں کی برات!
چیونٹیاں جیسے ذہن پر رینگیں — اُف یہ میرے لطف احساسات
صرصر شب کہاں کہ پتوں میں — کرب غم سے کراہتی ہے رات

ڈھل گئی ہستیٔ دل یوں تری رعنائی میں — مادہ جیسے نکھر جائے توانائی میں

رقصاں ہیں منڈیر پر کبوتر — دیوار سی گر رہی ہے دل پر

نئی غزل کے ان تجربات سے بعض دلچسپ باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ یعنی ایک طرف اظہار کے لئے ایک منجھا ہوا اور روایت میں رچا ہوا ذریعۂ اظہار ضروری ہے، جو بڑی مدت میں بنتا اور معنی کی سمائی پیدا کرتا ہے۔یہ بھی تاثیر کے لئے کسی حد تک ضروری ہوتا ہے، کہ آدمی زیادہ چونکنے نہ پائے اور شعر کا جادو ٹوٹ کر نہ رہ جائے۔ دوسری طرف ذریعۂ اظہار کی یہی پختگی اس کا ایک کمزور پہلو بھی ہے، کہ طبیعت شعر میں ندرت تخلیق بھی چاہتی ہے۔ بعض اوقات لفظ کا نشتر صرف ایک ہی دفعہ چل کر کند ہوجاتا ہے۔ روایت و جدت سے بہ حد اعتدال نہیں بلکہ تاحد کمال کام لینا ہی شاعری ہے، اور اس میں کوشش سے زیادہ کمال ہی کو دخل ہوتا ہے۔

جہاں جہاں رئیس صاحب کا بہ شعوری یا ذوقی رجحان کمال تک پہنچا ہے بڑے اچھے اچھے شعر ہوئے ہیں :

نہ عبارت نہ اشارت نہ بیاں لازم ہے — روح معنی سے فقط ربط نہاں لازم ہے
داغ لالہ کو ابھی سے ہے تمنائے نمود — چند دن صحبت خونیں جگراں لازم ہے

کہ نغمہ شوق اہل تمنا کے لئے ہے — یہ گیت کسی مطرب فردا کے لئے ہے
نغمہ پرداز تو نغمے کو جگا دیتا ہے — نغمہ وساز کا کیا کام ہے معلوم نہیں
زندگی میں کہ ہمہ معرکہ آرائی ہے — کس قدر نظم ہے، ترتیب ہے، رعنائی ہے
جب ادھر سوز محبت میں کمی ہوتی ہے — دیکھتا ہوں کہ ادھر آگ لگی ہوتی ہے
قافلے جن کی ہدایت پہ رواں ہوتے ہیں — کسی گمراہ کے قدموں کے نشاں ہوتے ہیں
حقیقت کیا ہے اس کرب نہاں کی — یہ قیمت ہے تو کس جنس گراں کی؟
غبار آلود ہے کیوں چہرہ وقت — یہ آخر گرد ہے کس کارواں کی
ظہور عہدنو برحق مگر یہ کیا قیامت ہے — شفق ہے خوں چکاں ابتک سحر ہے سینہ چاک ابتک
نسیم صبح اس ناز شگفت گل سے کیا حاصل؟ — ہزاروں پھول محروم نمو ہیں زیر خاک ابتک

ان کا ذوق مفکرانہ ہے :

"جان لیوا سہی جراحت عشق — عقل کا زخم ہے بہت کاری"

لیکن ان کا یہ خیال کہ صرف "خرد" ہی سے "رعنائی افکار" پیدا ہوتی ہے، غور طلب ہے۔ اپنے صحیح مقام کو پانے کے لئے شاعر کو فلسفی کی ڈگر سے کچھ ہٹنا پڑتا ہے۔ ورنہ شعر کے لئے کوئی جواز نہیں رہتا۔

حصہ نظم میں قصیدے کا سا شکوہ ہے اور کہیں غزل کی سی نزاکت بھی۔ الفاظ سے کھیلنا ہر شاعر کی تھوڑی بہت کمزوری ہوتی ہے۔ رئیس صاحب نے یہ کام نسبۃً زیادہ ہنرمندی سے کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مجموعہ عموماً بڑی پر تاثیر کیفیت اور با وقعت شاعری کا حامل ہے۔

نیم روز از مسعود تابش

اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۲۰۰ صفحات، قیمت ؟

محشر کی طرح مسعود الحسن تابش نے بھی اپنے تیس پینتیس برس کے کلام کو بہت کاٹ چھانٹ

کر پیش کیا ہے۔ خیر، یہ شعر ہیں کچھ آم تو نہیں کہ میٹھے ہوں اور بہت ہوں۔ تابش کے ہاں تو شیرینی کے ساتھ کچھ تلخی بھی گھلی ہوئی ہے، ایسی ہی جیسی کہ فانی کے ہاں تھی، جن کا وہ دانستہ اور بالاعلان اتباع کرتے ہیں۔ فانی کو غالب کا متبع کہا جاتا تھا، گو انہیں خود یہ تسلیم نہ تھا۔ لیکن بیسویں صدی کا پورا دور ہی غالب سے متاثر ہے۔ وحشت و فانی پر غالب کے باطن سے زیادہ ظاہر کا پرتو خاص طور پر نمایاں تھا۔ فانی یاس کے شاعر ہیں، لیکن ان کے کلام میں کوئی بہت گہرا فکر نہیں ملتا۔ عموماً وہی جلوہ و پردہ، قضا و قدر کی باتیں ہیں۔ تابش کو بھی ان مسائل ابدی سے خاص دلچسپی ہے۔ اور انہوں نے بھی "عشرت درد" کو موضوع سخن بنایا ہے:

دل کی یکسوئی سے ہوتا ہے یہ ظاہر تابش — عشرت درد کا اب کوئی پیام آتا ہے
عشرت یاس میں یہ کشمکش غم کیا ہے — رنگ امید نے بدلا مرے کاشانے کا

ہر لمحہ ایک موت ہے ماتم ہے ہر نفس — اس زندگی کی ہم پہ ہے تہمت لگی ہوئی

جہاں تک انداز کا تعلق ہے، ان کے کلام میں ایک یکرنگی، ایک وضع داری ایسی ہے کہ بہت کم ہوتی ہے، اور اس حد تک ان کو صاحب طرز کہنا چاہیے۔ اضافت کے بغیر یہ بھی شعر نہیں کہتے لیکن جستہ جستہ نئی خوش آئند بندشیں اور ترکیبیں موجود ہیں اور ایجاز و ایما کی طرف رجحان واضح ہے:

محیط حسن نہیں ذوق دید کے انداز — کہ منتہائے نظر ہے نظر کا ہر آغاز

شوق یاس افزا سہی ہے شوق جان دل ہنوز — کچھ نہیں حاصل سوائے حسرت حاصل ہنوز
تماشا سوز ہے ہر جلوۂ انداز یکتائی — نہیں تم ہو کوئی پردہ بھی اب حائل نہیں ہوتا

بجوش پنجۂ گل جامہ تار تار ہوا — مرے جنوں کا سبب جلوۂ بہار ہوا
اللہ رے اعتماد بہاراں کہ ان دنوں — ہر شاخ سے ہے نسبت یک آشیاں مجھے

یہاں سخن ورزی، ذہنی و جذباتی تجربات پر حاوی ہے۔ کہیں صاف و سلیس شعر ہوئے ہیں تو تابش نے اسے طرز عام قرار دیا ہے:

دیکھ ادھر دور جام سے پہلے — مجھ کو ساقی تمام سے پہلے
منزل شعر دور ہے تابش — بچئے اس طرز عام سے پہلے

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایسے اشعار کم ہیں جنہیں انگریزی میں Quotable کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کے مخصوص رنگ کی اچھی غزلیں اور اچھے اچھے خوش آہنگ شعر موجود ہیں :

آغاز گل ہے شوق مگر تیز ابھی سے ہے ۔۔۔ یعنی ہوائے باغ جنوں خیز ابھی سے ہے
جوش طلب ہی موجب در ماندگی نہ ہو ۔۔۔ منزل ہے دور اور قدم تیز ابھی سے ہے
یہ ابتدائے شوق یہ پُر شوق دل مرا ۔۔۔ اک جام آتشیں ہے کہ لب ریز ابھی سے ہے
تابش بھری بہار میں کوئی بچھڑ گیا ۔۔۔ اب کے چمن میں بوئے خزاں تیز ابھی سے ہے

ظاہری زیبائش و آرائش میں بھی یہ مجموعہ سجانے کے قابل ہے۔

رقص طاؤس از ڈاکٹر صفدر حسین

مکتبۂ دانش افروز، لاھور، ۱۰۴ صفحات، قیمت، ۴ روپے۔

یہ مجموعہ متوسط طول و قامت کی چودہ رومانوی مگر بڑی متوازن، غیر مقفیٰ، رومانوی نظموں پر مشتمل ہے، جن کا عمومی موضوع محبت کی چند وارداتیں یا نا تمام سے افسانے ہیں۔ انداز کلام صرف بیانیہ نہیں بلکہ تغزل آمیز ہے۔ قافیہ بہت کم آنے پایا ہے، بلکہ بعض جگہ آنے کو ہوا تو شاعر نے اسے دبا دیا ہے :

یوں دبے پاؤں طرب خیز ہوا چلتی تھی ۔۔۔ جیسے دریا کے قریں رقصِ غزالانِ ختن
سبزۂ نرم پہ مخمل کا گماں ہوتا تھا ۔۔۔ زلف مشکیں کی گرہ کھولتی تھی شب کی دلہن

شاعر نے یوں لکھا ہے : ” زلف مشکیں کی گرہ شب کی دلہن کھولتی تھی “

جہاں تک فارم کا تعلق ہے، ان اشعار کو ”بے قافیہ ابیات“ کہنا زیادہ درست ہوگا کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے دو دو مصرعوں کے جوڑے ملائے ہیں - نظم معریٰ روایۃً بیتوں میں بٹی ہونے کی بجائے مسلسل ہوتی ہے اور اس کی اکائی ایک سطر یا مصرع ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں نظم معریٰ کی تکنیک کا پورا فائدہ مصرعوں کو باہم پیوست کرنے یعنی run - on - lines سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے کئی شاعروں نے ارکان بحر کو گھٹا بڑھا کر یہی فائدہ حاصل کیا ہے۔ صفدر صاحب کے اکثر مصرعے مکمل جملے ہیں۔ عروض سے قطع نظر، یہ گویا نحو پر ایک بندش ہوئی اور کشادگیٔ بیان کے منافی معلوم ہوتی ہے جو نظم معریٰ کا مقصود ہے۔

ان نظموں میں شاعر نے اپنے جذبات اور داخلی کیفیات کی شرح بڑی شستگی اور حسن آفرینی کے ساتھ کی ہے ۔ کلام رواں اور ہموار ہے ۔ داخلیت سے صرف ایک ہی جگہ اچانک اور غیر متوقع گریز ملتا ہے :

اب مرے دوست مرے بھائی مجھے بڑھنے دے
وہ نگہ تشنہ، دیدار نظر آتی ہے
رونے افسردہ بہ غلطیدہ ہے اب تک مری یاد
سسکیوں کی مرے کانوں میں صدا آتی ہے
حسن پر آج بھی ہے جبرِ رسوماتِ کہن
عشق رہ جاتا ہے کھولے ہوئے خالی آغوش
عصر حاضر میں بھی افلاس و امارت میں ہے فرق
آج بھی نسل و عقائد کی حدیں ہیں قائم
آج بھی بنتا ہے ناکامیٔ الفت کا سبب
نسل اور خون کا پندار حکومت کا گھمنڈ
آج بھی ذہن زمیں عشق کا ہم درد نہیں
اب بھی ہے بستۂ سلطان و گدا نوعِ بشر
اب بھی انسان ہے اک صید زبون طبقات
اب بھی ہوتی ہے روایت کے بتوں کی پوجا
اب بھی جذبات سے چاندی کا ورق بھاری ہے
اب بھی ہلکا ہے زر و لعل سے خون انسان

جناب جوش ملیح آبادی نے صفدر صاحب کی معرا شاعری کو اردو ادب میں ''ایک قابل قدر اضافہ'' کہا ہے ، نیاز صاحب نے ایک ''دلکش دریافت'' ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کے خیال میں یہ مجموعہ نظم پابند اور نظم آزاد کے درمیان کا خلا پُر کرتا ہے، اور مربوط معنوی تسلسل کی اچھوتی مثال ہے ۔ ہمارے خیال میں یہ جدید نظم میں ''مربوط بیانیہ تسلسل'' کا پہلا تجربہ نہیں ہے ۔ اس کی خصوصیت اس کی ہیئت یا تکنیک نہیں بلکہ خوش گفتاری اور تخئیلی انداز بیان ہے ۔ بیشک اس لحاظ سے یہ مجموعہ اردو کی رومانوی نظموں میں بڑا اچھا اضافہ ہے ۔ ش-ح-ح

اردو لغت کی مجمل اشاعت

اردو لغت کے سابقہ اجزا جو ''اردو نامہ'' کے ساتھ ساتھ قسط وار چھپتے رہے ہیں، چار آنے فی جزو کی شرح سے طلب کیے جا سکتے ہیں ۔ جو اصحاب مکمل اجزا محفوظ رکھنا چاہیں، جلد طلب فرمائیں کیونکہ آئندہ ان کا حاصل ہونا محال ہوگا ۔　　مینجر

سرکاری جرائد کے مستقل خریدار بن جائیے

چندۂ سالانہ

١ - پاکستان گزٹ، جملہ حصص، مع ضمیمہ جات و جرائد خصوصی — ٧٨ روپے
٢ - ٹریڈ مارکس جرنل (ماہانہ) — — ٥٢ روپے ٣٣ پیسے
٣ - اسٹیٹیسٹی کل بلیٹن (جریدۂ اعداد و شمار) (ماہانہ) — — ٥٣ روپے
٣ - پاکستان ٹریڈ (ماہانہ) — — ٣٠ روپے
٥ - پاکستان سپریم کورٹ کی رپورٹیں (ماہانہ) — — ١٦ روپے ٥٠ پیسے
٦ - پاکستان لیبر گزٹ (سہ ماہی) — — ٧ روپے ٥٠ پیسے
٧ - اگریکلچر پاکستان (سہ ماہی) — — ١٠ روپے
٨ - زراعت پاکستان (اردو) (سہ ماہی) — — ٨ روپے
٩ - پاکستان کریشی (بنگالی) (سہ ماہی) — — ٣ روپے
١٠ - پاکستان میں بیرونی سفرا ، مشیران تجارت و دیگر
غیر ملکی نمائندوں کی فہرست (سہ ماہی) — — ٨ روپے

تمام سالانہ چندے بابت یکم جولائی ٦٣ تا ٣٠ جون ٦٥ء
حسب ذیل پتے پر پیشگی وصول ہوجانے چاہیں -

منیجر مطبوعات حکومت پاکستان

بلاک نمبر ٣٣ شاہراہ عراق ، کراچی - ١

ترقیٔ اردو بورڈ کی مرتب کردہ مطبوعات

مرآۃ العروس ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم — مع مقدمہ و فرہنگ
مرتبہ : جناب ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ
ناشر: ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی، لاہور — قیمت ٣ روپے

منتخب الحکایات ڈاکٹر مولوی نذیر احمد مرحوم — مع مقدمہ و فرہنگ
مرتبہ : جناب شاہد احمد دہلوی
ناشر: ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور — قیمت ٢ روپے ٦٢ پیسے

منازل السائرہ علامہ راشد الخیری مرحوم — مع مقدمہ و فرہنگ
مرتبہ : جناب رازق الخیری
ناشر: جنرل پبلشنگ ہاؤس بندر روڈ، کراچی — قیمت ٥ روپے

سالنامہ نگار پاکستان سنہ ۱۹۶٤ء

" تذکروں کا تذکرہ نمبر "

شائع ہوگیا

جس نے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کیا ھے کہ:

(۱) تذکرہ نگاری کا فن کیا ھے؟ (۲) اس کی امتیازی روایات و خصوصیات کیا رھی ھیں؟ (۳) تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ھوا؟ (۴) اردو، فارسی میں آج کتنے تذکرے لکھے گئے؟ (۵) ان تذکروں اور مصنفین کی کیا نوعیت ھے؟ (۶) ان میں کتنے اور کن کن شاعروں کا ذکر آیا ھے؟ (۷) اس سے کسی خاص عہد کی ادبی و سماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ھے؟ (۸) ان تذکروں میں اردو، فارسی زبان و ادب کا کتنا بیش بہا خزانہ محفوظ ھے؟ (۹) یہ خزانہ ادب کے تاریخی، تحقیقی، سوانحی اور تنقیدی شعبوں کے لئے کس درجہ مفید اور کتنا اہم ھے۔

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں۔

نگار پاکستان ۔ ۳۲ ۔ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی ۔ ۳

ماھنامہ

خاتون پاکستان (کراچی)

ربیع الاول ۱۳۸۲ھ مطابق جولائی ۱۹۶۲ع

میں پھر

دستاویزی اھمیت کی حامل مقدس تحریروں سے مزین عظیم اور شاندار

رسول نمبر

شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ھے۔

اس نمبر میں عالم اسلامی کے مشاھیر علماء، ادباء اور شعراء کی شرکت کے علاوہ مشرق سے مغرب تک رسول اکرم کا پیغام اس دنیا کے جن جن گوشوں تک پہنچ چکا ھے' وھاں کے عقیدت کیش اکابر بھی اس میں حصہ لے رہے ھیں۔

یہ مثالی شمارہ **ایک ہزار** صفحات پر مشتمل ھوگا۔

منیجر:۔ **خاتون پاکستان**، ۵۔ ۷ گارڈن، کراچی

انجمن ترقی اردو کا پندرہ روزہ ترجمان

"قومی زبان"

ایک جریدہ ——— ایک تحریک

جس کا ہر شمارہ

اردو زبان و ادب سے متعلق مسائل اور رفتار ترقی کا آئینہ ہوتا ہے -

*** چندہ مستقل عنوانات ***

* **نئے خزانے**

ہر ماہ کے اردو اخبارات و رسائل کے علمی و ادبی مضامین کی فہرست -

* **اردو کے سپاہی**

ایسی ہم عصر شخصیتوں کے بارے میں مضامین ، جنھوں نے عملی اور علمی دونوں محاذوں پر اردو زبان کی خدمت کی ہے -

* **علمی مسائل**

دفتر انجمن میں موصول ہونے والے علمی و ادبی سوالات کے جواب جو مشہور نقاد اور ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری کی طرفسے دئے جاتے ہیں -

* **گرد و پیش**

علمی ادبی اور تہذیبی خبریں -

* **گنج ہائے گراں مایہ**

انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں تقریباً دو ہزار مخطوطات ہیں، ان کی وضاحتی فہرست جو بالاقساط شائع کی جا رہی ہے -

* **علمی اصطلاحات**

انجمن کے پاس مختلف علوم و فنون کی تقریباً ایک لاکھ اصطلاحات ہیں جنہیں بالاقساط قومی زبان میں شائع کیا جا رہا ہے -

* **نئی مطبوعات**

اردو کی نئی مطبوعات کے بارے میں معلومات -

* **تبصرے**

تازہ مطبوعات پر تفصیلی تبصرے -

ہر شمارہ تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہوتا ہے -

قیمت فی پرچہ پچاس پیسے   قیمت سالانہ دس روپے

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو ، اردو روڈ - کراچی - ۱

۲ ۔ نشیب ، ڈھلان، ڈھلوان زمین ۔

طریق عشق میں اے دل عصائے آہ ہے شرط
کہیں چڑھاؤ ، کسی جا اتار راہ میں ہے

۱۸۴۶ آتش ، ک،۲ : ۲۵۲

جاتا تھا یوں اتار ہو رستے میں یا چڑھاؤ
جیسے ہوا میں جاتی ہے آب رواں پہ ناؤ

۱۸۷۴ انیس، مراثی ، ۱ : ۲۲۶

اس ناہموار اتار نے تمام تکلیفوں کا معاوضہ کردیا ۔

۱۹۰۵ وکرم اروسی ، ۱۱

آہستہ آہستہ آتار سے اترنا شروع کیا ۔

۱۹۲۳ عصائے پیری ، ۱۵۳

۳ ۔ دریا کے بہاؤ کا رخ

اگر کہا جائے کہ بغداد مقدم ہے بصرے پر ، تو یہ اس نسبت سے کہ قصد کرنے والا اتار کی جانب روانہ ہو ۔

۱۹۲۵ حکمت الاشراق ، ۱۴۰

(II) ۴۔ ازالہ، دفعیہ، دورہونا، رفع ہونا۔

بات کی مانندگی چڑی تھی ، سو اس کا اتار ہوا ۔

۱۶۳۵ سب رس ، ۲۶۳

(III) ۵ ۔ ضعف ، زوال، انحطاط ۔

جے بہار سر پہ ہے سو ترے ترت اتار لے
غافل نہ ہو کہ وقت ہے تیرا اتار پر

؟۱۶۷۸ غواصی ، ک ، ۵۷

اتار پر ہے سر صحن رقص پیپل کا
وہ کچھ نہیں ہے اب اک جنبش خفی کے سوا

۱۹۵۹ گل نغمہ ، ۲۳۱

اتار

(IV) ۶ ۔ (i) (نرخ کی) کمی ، گھٹاؤ ۔

ہنڈویات کا نرخ مشتہر کیا جاتاہے بوجہ عدم تیقن نرخ اور روزانہ چڑھاؤ اتار کے ۔

۱۸۹۸ معارف (حیدرآباد) ، اگست ، ۵۰

(ii) (نشہ کی) کمی ۔

عشق کے جام تھے ہے مست جنے
اس کی مستی کو کیں اتار نئیں

؟۱۶۷۸ غواصی ، ک ، ۱۴۱

بادۂ عشق اور ہے اس کا خمار اور ہے
اس کا چڑھاؤ اور ہے اس کا اتار اور ہے

۱۸۵۶ ک، ظفر ، ۴ : ۱۷۳

اللہ ری تیری نشہ کی سرشارئی سرور
جس کا اتار عیش ہے جس کا خمار عیش

۱۸۷۸ گلزار داغ ، ۲۰۹

نے پیے کی اس کی مستی نے نشے اس کا اتار
مفت کی اس کی عنایت مفت کا اس کا پیار

۱۹۱۰ جذبات نادر ، ۱ : ۱۶

۷ ۔ (دریا وغیرہ کے) پانی میں کمی ، جزر ، بھاٹا ۔

راضی ہوا ہے وصل پہ وہ گوہر مراد
بیڑا چڑھاؤں بحر الم ہے اتار پر

۱۸۷۲ مظہر عشق ، قلق ، ۵۷

ہو کے اونچے یوں گرے ہم جیسے آندھی کا غبار
چڑھ کے یوں اترے کہ آیا یاد دریا کا اتار

۱۸۸۹ لیل و نہار، ۲۸

ندیوں کے چڑھاؤ اتار ... سے محفوظ رہنے کے لئے ... ہنڈوؤں نے ... ذرائع آبپاشی کی طرف توجہ دی ۔

۱۹۱۳ تمدن ہند، ۱۴

(V) ۸ ۔ مصلح (کسی چیز کے) اثر کا زائل کرنے والا ۔

چڑھے گا جس پہ یہ جن جان لے کے اترے گا
نہیں ہے نشۂ الفت اتار سے واقف
۱۸۶۲ مظہر عشق ، قلق ، ۹۳

زہر بنایا ہے تو ساتھ ہی اس کا اتار بھی پیدا کیا ہے۔
۱۹۲۱ لڑائی کا گھر ، ۳۰

دے دیا تھا غشی کا اس کو اتار
ایک گھنٹے میں وہ ہوئی ہشیار
۱۹۳۶ جگ بیتی ، کیفی، ۱۰

۹ ۔ (i) جادو کا توڑ، ردّ سحر۔

اس سایے کا اتار محمدی خانم سے محال ہے۔
۱۸۸۰ فسانۂ آزاد، ۲: ۱۲۳

تو ایک ساحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کارد ، نہ جادو کا آتار۔
۱۹۱۴ حالی ، مقالات ، ۱ : ۲۰۵

اس کے سر پر جو بھوت چڑھا ہوا ہے ، اس کا اتار میرے پاس ہے ۔
۱۹۳۶ پریم چند ، گوشۂ عافیت ، ۱ : ۲۵

(ii) صدقہ ، جو چیز کسی کے سر پر سے قربان کرکے ، فقرا کو دے دی جائے ۔ (نفائس اللغات)

(VI) ۱۰ ۔ (i) گھاٹ، (دریا کا) کنارہ ۔

(ii) (دریا کے) پار جانا ، (دریا کو) عبور کرنا ۔

(VII) (ب) صف

۱۲ ۔ ادنٰی ، کمتر (قیمت یا درجے کا) ، گھٹیا ۔

کیا ہے وو کس دھات اوتار کام
سو کہتا ہوں سن کھول تج کوں تمام
۱۶۳۹ طوطی نامہ، غواصی، ۴۵

سنگاروں میں وہ سب سے گو ہے اتار
پہ کہتے ہیں چوٹی کا اس کو سنگار
۱۷۸۴ سحرالبیان ، ۶۸

۱۳ ۔ نیچ ، کمین۔

بیٹھی لڑے وو بیٹھے سے چلتی سوار سے
منہ چڑھ کے بولوں نوج میں ایسی اتار سے
راحت (بحوالۂ فیلن)

[پا : اوتار ، س : اَوتار (اَو + تَر)=اتر نا ، قب : پ : اَو یار = گھاٹ]

۔۔۔چڑھاو

(فت چ) امذ

۱ ۔ اترنا چڑھنا، اوپر نیچے کے پھیرے ، نا ہموار زمین پر چلنا ۔

کئی آتار چڑھاو کے بعد ایک گنبد نظر آیا۔
۱۸۰۲ باغ و بہار ، ۱۹۵

۲ ۔ کسی کیفیت کا بار بار طاری ہوکر زائل ہونا یا رہ رہ کر عود کرنا ۔

دو مہینے اتار چڑھاو رہ کر پاؤں پر ورم ہوجاتا ہے۔
۱۸۶۳ تریاق مسموم ، ۳۶

۳ ۔ آرتی ، ہاتھ کی حرکت سے کسی چیز کو کسی کے سر سے صدقہ کرنے کا عمل جو ہندوؤں میں رائج ہے۔

چراغ گھی کے روشن کیے اور مورت پر سے آتار چڑھاو کرنے لگے ۔

۱۹۱۱ ظہیر ، داستان غدر ، ۲۱۷

اف : کرنا

۴ ۔ بلندی و پستی ، نشیب و فراز، اونچی نیچی نا ہموار زمین ۔

اتار چڑھاو کا ہموار کرنا ... سکھایا۔

۱۸۸۰ نیرنگ خیال، ۱ : ۲۸

۵ ۔ مد و جزر، جوار بھاٹا ۔

لیاقت ایک دریا ہے اور پھر ان کی لیاقت ایک بحر ذخار تھا جو ہر وقت متحرک اور متموج تھا جس کا اتار چڑھاو دید نہ شنید ۔

۱۸۹۶ مجموعۂ نظم بے نظیر (التماس) ، ۲

سمندر میں جوار بھاٹا جسے مد و جزر یعنی پانی کا اتار چڑھاو کہتے ہیں ۔

۱۹۱۹ سید احمد ، راحت زمانی ، ۸۱

۶ ۔ (مجازاً) عروج و زوال، فتح و شکست ۔

اس سلطنت نے وہ وہ اتار چڑھاو دیکھے ہیں جو روئے زمین کی کسی پچھلی سلطنت نے نہیں دیکھے ۔

۱۹۱۸ مسئلہ شرقیہ ، ٦

۷ ۔ کمی بیشی، زیادتی اور کمی ۔

.. لوگوں کو مریض کی حرارت کے اتار چڑھاو کی ایسی لگی رہتی تھی کہ آج ایکسچینج کے اتار چڑھاو کی بھی کسی کو نہیں ۔

۱۸۹۹ رویائے صادقہ ، ۳۷

جان ایسا فلسفی نہیں ہے کہ رات دن تھرمامیٹر لیے محبت کا اتار چڑھاو دیکھتا رہے ۔

۱۹۱۲ .ج دلاری ، ۴۸

۸ ۔ ارزانی و گرانی ۔

بتوں کی تمہیں د ر کا .ار چڑھاو
بہ رہے گا یہی بھاؤ دن ڈھیے کیوں کر

۱۹۵۷ یاس چنگیزی ، گنجینہ، ۴۲

۹ ۔ بحث و تکرار ۔

آخر آدھ گھنٹے کے .ار چڑھاو ، حجت و تکرار کے بعد وہ چ یس روپے کے .ریجی نوٹ . . . .در ہوگئے ۔

۱۹۳۳ ا.ر ی .سے ، ۲۱

۱۰ ۔ (مجازاً) نیک و بد، جوڑ توڑ، تدابیر ۔

جو کچھ تو اپنی عقل سلیم سے جنگ کے اتار چڑھاو بیان کرے گا ، ہمارا فرض ہے کہ ہم بہت غور سے سنیں ۔

۱۸۹۲ عمر و عیار کی سوانح ، ۲۲۳

۱۱ ۔ چھل، فریب ، اینچ پینچ۔

اف : بتانا، دینا۔

۱۲ ۔ زیر و بم ۔

ہمارا علم ہے الفاظ کا اتار چڑھاو
کہ اتنا بس ہے فضیلت کی انتہا کے لیے

۱۸۹۶ مجموعۂ نظم بے نظیر ، ۱۲۰

موجودہ افسانے کا بنیادی نقطہ ہی ذہنی اتار چڑھاو ہے۔

۱۹۳۶ پریم چند، میرے بہترین افسانے، ۷

۱۳۔ (مجازاً) نشیب و فراز، اونچ نیچ۔

غرض اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس کی حاجی کو اپنے سفر کے اتار چڑھاو کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں میں ضرورت پیش آتی ہے۔

۱۹۳۰ سفر حجاز، ۹

[ا : آتار + چڑھاو (رک) مرکب عطفی]

ــ چڑھاؤ دینا محاورہ

۱۔ ترغیب دینا، پٹی پڑھانا۔

زن مرید خاوند کو اتار چڑھاو دے دلا . . . جھٹ نکال لاتی ہے۔

۱۸۹۹ ہیرے کی کنی، ۵۱

دیے ناصح نے گو اتار چڑھاو
اس کی باتوں میں ہم کب آتے ہیں

۱۹۰۵ یادگار داغ، ۱۸۷

۲۔ (موسیقی)، (سُرکو) کبھی مدھم کرنا کبھی اونچا۔

ــ چڑھاو کرنا محاورہ

دفعیہ کرنا، ازالہ کرنا۔

سنبیے کا جادو چل گیا تھا اگر سری کرشن اس کا اتار نہ کرتے۔

۱۹۱۹ کرشن بیتی، ۱۱۹

ــ لی منھ کی لوٹی تو کیا کرے گا کوئی کہاوت

بے شرم سب کچھ کرسکتا ہے، بے حیا سے کوئی بات بعید نہیں۔

اتار لی منھ کی لوٹی تو کیا کرے گا کوئی، جب بے غیرتی ہی پر کمر باندھ لی تو پھر کیا علاج۔

۱۹۰۸ صبح زندگی، ۱۳۰

اُتارا (ضم ا) (الف) امذ

(I) ۱۔ (لشکر وغیرہ کا) پڑاؤ، قیام۔

وائے محرومی نہ پہنچے چشمۂ مقصود کو
سوکھے گھاٹوں تشنہ کاموں کا اتارا ہوگیا

۱۸۳۶ ریاض البحر، ۲۵

عشق ابرو میں کیا سر سے کنارا ہم نے
تیغ کے گھاٹ اتارا نہ ہوا تھا سو ہوا

۱۸۷۶ سخن بے مثال، ۲۲

مری طبع رواں کا پھر اسی گھاٹ اب اتارا ہے
تماشا دیکھیے بحر سخن کے جزر کامد کا

۱۹۰۵ محسن، ک، ۹۶

۲۔ (مسافر کی) آمد، نزول۔

صدقے میں ایسے بھی اتارے کے
سوگئے بخت گھر ہمارے کے

۱۸۱۰ میر، ک، ۹۹۹

تم ہمارے ساتھ آؤ تو ہم تمہارے بھائیوں کے اتارے کا مقام بتلادیں۔

۱۸۴۵ احوال الانبیا، ا : ۲۰۷

۳۔ (مردے کا) قبر میں اتارا جانا، تدفین۔

سرا کی فکر میں آگے کسے بڑھنے کا یارا ہے
کڑی ہے پہلی منزل قبر میں اپنا اتارا ہے

۱۸۵۸ امانت، د، ۸۸

برسوں سے مسکتے ہیں کہاں صورت آرام
مدفن میں بھی اپنا تو اتارا نہیں ہوتا

۱۸۶۴ نسیم دهلوی ، د ، ۶۴

(II) ۴ - پہاڑی سے میدانی علاقے کی طرف آمد ، اترائی۔

۵ - پہاڑ کا نشیبی حصہ، نشیب

(III) ۶ - چھاؤنی ، عارضی قیام گاہ، اترنے کی جگہ ۔

اندر کا اکھاڑا کہوں یا پریوں کا اتارا۔

۱۸۰۲ باغ و بہار ، ۸۵

پرانے زمانے میں یہاں ایک پری کا اتارا تھا۔

۱۹۴۲ الف لیلہ (منصور)، ۲ : ۳۷۳

۷ - پڑا ، ٹانڈا۔

ہر چمن میں گویا پریوں کا اتارا تھا ۔

۱۸۰۲ نثر بے نظیر ، ۲۴

اتارا ہو پریزادوں کا دل میں چشم بینا میں
ہو ذکر گوپیاں گوکل میں بندرابن میں متھرامیں

۱۹۰۵ محسن ، ک ، ۷۲

(IV) ۸ - راستہ ، مسافت (جو ہنوز طے کرنی ہے)۔ (بحوالۂ فیلن)

۹ - (دریا) پار جانے کا راستہ، دریا کا پاٹ (جہاں پانی کم ہو اور جہاں سے دریا کو عبور کریں)۔

تری شمشیر پُرخم نے ہزاروں سر اتارے ہیں
یہی تو گھاٹ ہے بحر محبت کے اتارے کا

۱۸۷۸ گلزار داغ ، ۳۰

۱۰ - گھاٹ، (دریا کا)، کنارہ جہاں سے دریا پار کیا جائے۔

گنگا کا اتارا تا دیر بند رہنے سے لوگ خودبخود جان جائیں گے ۔

۱۸۹۶ مصائب غدر ، ۱۴۲

۱۱ - گھاٹ یا کشتی کا بھاڑا یا پار اترنے کا محصول ۔

(V) ۱۲ - عبور و مرور ، دریا کے پار جانا۔

دم سے تھا بحر خوں کا کنارا لگا ہوا
جانوں کا گھاٹ پر تھا اتارا لگا ہوا

۱۸۷۴ انیس، مراثی، ۱ : ۲۰۵

پل تختہ خندق پر پڑگیا، فوج ظفر موج کا اتاراہوا۔

۱۸۸۸ طلسم ہوش ربا، ۳: ۴۳

کیا دیکھتے ہو راہ میں انجام ھمارا
دریا سے اتارا ہے سر شام ھمارا

۱۸۹۱ تعشق، براهین غم، ۱: ۱۴

۱۳ - (سواروں کا لڑنے کے لئے گھوڑے کی پشت سے اتر کر) پیادہ (ہونا)

جب چڑھ آئی رو برو فوج جنوں
ہم بھی سنمکھ ہو اتارے ہوگئے

۱۷۹۱ دیوان زادہ حاتم (ق) ، ۴، ۳

تلواریں سوت کر اتارے ہوجاتے ہیں ۔

۱۸۰۵ آرائش محفل، افسوس، ۵۵

مطلب یہ ان کا تھا کہ ابھی سب کنارے ہوں
میدان جنگ میں ہمیں پہلے اتارے ہوں

۱۸۷۴ انیس، مراثی، ۳: ۸۲

(VI) ۱۴ ۔ رد سحر و دفع بلا کا عمل، جھاڑ پھونک ۔

مشکل اس سایے کا اتارا ہے
اس کو تو اک پری نے مارا ہے

۱۸۷۱ شوق، بہار عشق، ۷

کاہن بتلا کوئی اتارا
جینے کا تو اس کے ہو سہارا

۱۹۲۸ مرقع لیلیٰ مجنوں (اشاعت رام نرائن)، رسوا، ۲۴

جادو، ٹونے، ٹوٹکے کا اتارا کرتے رہیے۔

۱۹۳۰ اودھ پنچ، ۱۵: ۳، ۹

۱۵ ۔ دفعیہ، ازالہ (جادو اور مرض وغیرہ کا)۔

جنے سائیں کے عشق کا مد پیا ہے
نہ کر سے اسے ہور مستی اوتارا

۱۶۱۱ قلی قطب شاہ، ک، ۲۹۶

وہیں کتنے سرسوں کے دانے منگا
اتارے کا منتر جو کچھ یاد تھا

۱۸۰۲ بہار دانش، ۲۷

۱۶ ۔ (i) صدقہ، کوئی چیز جو وار پھیر کے بعد فقرا کو دی جائے، چاول یا آٹا وغیرہ جسے برتن میں بھر کر آسیب زدہ یا بیمار پر سر سے پاؤں تک سات مرتبہ وار پھیر کے خیرات کردیا جائے۔

منتر اور جنتر سوں سمج اس کی راس
اتارے سٹنے لگے بے قیاس

۱۶۵۷ گلشن عشق، نصرتی، ۵۷

تیرا صدقہ ہے جو دنیا میں ہوا ہے مشہور
فتنۂ حشر ترے قد کا اتارا نکلا

۱۹۰۵ گفتار بیخود، ۱۶

جان زلفوں سے بچائی جگر و دل دے کر
ان بلاؤں کے کئی آج اتارے نکلے

۱۹۳۳ ریاض رضواں، ۲۹۹

(ii) چوراہے کے بھوت (مسان) کو پیش کی جانے والی قربانی۔

کوئی بیمار ہو تو دوا دارو کو تو نہ پوچھیں مگر گنڈے، تعویذ، آتاروں، ٹوٹکوں سے گھر بھر جائے۔

۱۹۱۷ مراری دادا، ۲۵

۱۷ ۔ چوراھہ جہاں صدقہ اتارا جائے۔

۱۸ ۔ نقل، مثنیٰ ۔

۱۹ ۔ (i) زمین جو مندر کے لئے وقف کی جائے۔

(ii) (کسی شخص کی خدمات کے اعتراف میں) حکومت کی طرف سے جو زمین بطور عطیہ دی جائے اور جس کا لگان معاف ہو۔ (بہ حوالۂ فیلن، ۱۸)

(ب) صف، مسند

(۲۰) اتارو، آمادہ۔

پاس کب کرتے کسی کا ہیں ظفر وہ بے باک
شر پہ جو آپ ہی اپنے ہوں اتارے پھرتے
؟۱۸۵٦ ک، ظفر، ۳: ۱۹۵

[س: اَوتارک (او + تار + ک)]

ــــ اتارنا محاورہ

وارنا، صدقے کرنا۔

اپنے ہی پہ قربان کیا آپ نے اس کو
دشمن کا اتارا نہ اتارا مرے سر سے
۱۹۰۵ یادگار داغ، ۱۳۲

۲۔ (لشکر یا جماعت کا) پڑاو کرنا (لشکریوں کو) کسی جگہ لا ٹھہرانا۔

ــــ جانا محاورہ

(کسی کا) مارا جانا، قتل کردیا جانا۔ (متروک)

جو کوئی اپنی عزت کے خاطر اتار یا گیا سو شہید ہے۔
۱٦۳۵ سب رس، ۱۸۰

ــــ دینا محاورہ

قربان کرنا، بھینٹ چڑھانا، صدقہ کرنا۔

غیر پر بھاری ستارے ہیں کئی
تم اتارا دو کٹورا پھول کا
۱۹۰۵ یادگار داغ، ۱۳۹

ــــ کرنا محاورہ

۱۔ نزول کرنا، (اوپر سے) نیچے آنا۔

۲۔ پڑاو ڈالنا، چھاؤنی کرنا، فروکش ہونا

ندی پر اتارا کرنے لگے۔
۱۸۰۳ اخلاق ہندی، ۱۵۳

چاہتے ہیں کہ اس پارا تارا کریں کہ صحرا سے گرد آڑی۔
۱۹۰۰ طلسم خیال سکندری، ۲: ۷۵۹

۳۔ صدقہ اتارنا، (جانور وغیرہ کی) قربانی دینا۔

تو چڑھا شب کو جو مہتابی پہ بھر چشم بد
آسماں سے اتری کرنے کو اتارا چاندنی
۱۸۴۴ نسیم لکھنوی، د، ۴۰

۴۔ جھاڑ پھونک کرنا، سحر و بلا کو رد کرنے کے لئے عمل پڑھنا یا پڑھانا۔

ہر ایک مرض کو نظر گزر، پرچھاواں، جھپیٹا اور آسیب سمجھ کر بجائے دوا کے جھاڑ پھونک، اتارا کیا کرتی ہیں۔
۱۸٦۸ مراۃ العروس، (دیباچہ دوم)، ۵۳

اماں نے اس کا اتارا کیا جب خدا خدا کرکے وہ اچھا ہوا۔
۱۹۰۰ شریف زادہ، ۹٦

ــــ ہونا فل

۱۔ پڑاو پڑنا، قیام ہونا۔

اے جنوں ہوتے ہیں صحرا پر اتارے شہر سے
فصل گل آئی کہ دیوانے سدھارے شہر سے
۱۸۴٦ آتش، ک، ۱: ۱۴۲

۲۔ قتل ہونا، مارا جانا۔

وائے محرومی نہ پہنچے چشمۂ مقصود کو
سوکھے گھاٹوں تشنہ کاموں کا اتارا ہوگیا

۱۸۳۶ ریاض البحر، ۲۵

۳. ہاتھوں پر لے کر آہستگی سے قبر میں اتارا یا لٹایا جانا.

برسوں سے سسکتے ہیں کہاں صورت آرام
مدفن میں بھی اپنا تو اتارا نہیں ہوتا

۱۸۶۴ نسیم دہلوی، د، ۶۴

۴. صدقے ہونا، قربان کیا جانا.

رکھتے نہیں دم بھر بھی اسے سینۂ عشاق
وہ دل جو ترے سر سے اتارا نہیں ہوتا

۱۸۶۴ نسیم دہلوی، د، ۶۴

۵. (دریا کو) عبور کرنا، پار اترنا.

روؤں دریا کے کنارے اگر اے بحر صفا
ایک بھی آٹھ پہر میں نہ اتارا ہوگا

۱۸۷۲ فیض نشان، ۱۰

بادشاہ نے فرمایا دریائے بحرین سے کل اتارا ہوگا.

۱۹۰۰ طلسم نوخیز جمشیدی، ۱: ۲۸۵

۶. اتارو ہونا، تل جانا، آمادہ ہونا.

ہم جو رونے پر اتارے ہوگئے
ہٹ کے سب دریا کنارے ہوگئے

۱۸۹۵ گوہر انتخاب، ۲۳۵

۷. پیادہ ہونا، گھوڑے کی پیٹھ سے جنگ کرنے کے لئے اترنا.

میدان عشق میں سے چڑھ گھوڑے کوں نکلا
مارے گئے سپاہی جتنے ہوئے اتارے

۱۸۱۰ میر، ک، ۸۲۷

زینب کے پسر بھی ہوئے سوئے فردوس سدھارے
تب حضرت قاسم ہوئے میدان میں اتارے

۱۸۵۵ میر ضمیر، مجموعۂ مرثیہ، ۱: ۱۶۷

اُتارْگی (ضم ا، سک ر) امث (قدیم، متروک) اوتارگی.

آمد، و رود (مجازاً) پیدائش

ہے دنیا میں خوش تیری اوتارگی
سُہیں جگ میں تج کوں یو چوسارگی

۱۶۳۸ چندر بدن و مہیار، ۹۹

[ا: آتار + گی (= ی) لاحقۂ اسم کیفیت]

اُتارَن (ضم ا، فت ر) امذ نیز امث

۱. رک: "اترن"

غیرت بیگم کا اتارن پہن، معزز ماما یا داروغہ کا بھیس بنا، بیگم مبتلا کے گھر جا داخل ہوئی.

۱۸۸۵ محصنات، ۱۹۰

ساری عمر دین بی بی کو دنیا بی بی کا اتارن ہی پہنتے گزری.

۱۸۹۵ لیکچرز، نذیر احمد، ۱: ۲۹۶

یہ کوٹ میرا ہی اتارن ہے، یہ ڈھیلا پتلون میرا ہی عطیہ ہے.

۱۹۱۰ انتخاب فتنہ، ۶۶

اپنے مالک یا مالکہ کی اتارن یعنی ان کے اتارے ہوئے کپڑے پہنا کرتے تھے.

۱۹۲۶ شرر، مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، ۲۹۸

خاصہ نہ سہی بلا سے کھرچن ہے بہت
تن ڈھکنے کو صاحب کا اتارن ہے بہت

۱۹۳۴ غالب شکن، یگانہ، ۳۲

۲۔ اتارنا کی جگہ اور اس کے معنوں میں (قدیم)۔

جب آیا دیکھنے عرش عالی انگے
چلن تس پہ نعلین اتارن منگے

۱۶۵۷ گلشن عشق، نصرتی ۱۶۱

[ا : اسم کیفیت "اتارنا" سے]

اُتارْنا (ضم ا سک، ر) فم

۱۔ اوپر سے نیچے لانا، بلندی سے پستی کی طرف لانا۔

فروغ رخ کے مضامیں کنار فکر میں ہیں
فراز چرخ سے آغوش میں اتارا چاند

۱۸۶۴ نسیم دہلوی، د، ۱۳۹

۲۔ زمین پر لٹکانا۔

روانہ ہوا شہ جنازے کوں لے
سو منزل پہ لیادک اتارے تلے

۱۶۳۸ چندر بدن و مہیار، ۱۱۸

گھڑی میں و وساتویں دریا الںگ
اتار اس محل میں پھر اس کا پلنگ

۱۶۵۷ گلشن عشق، ۹۷

مزدور کہیں سامان اتار رہے ہیں کہیں لاد رہے ہیں۔

۱۹۱۷ اسمعیل میرٹھی، اردو کی پانچویں، ۲۲

۳۔ گڑھے یا جوف میں رکھنا، بھرنا یا سمانا، سطح زمین کے نیچے پہنچانا، قبر میں رکھنا۔

دیا اس کوں پشتی توں ہارون کوں
زمیں میں اتاریا سو قارون کوں

۱۶۴۵ قصۂ بے نظیر، ۲

پیر مغاں بھی عامل کامل سے کم نہیں
شیشے میں جن کی طرح اتارا ہے آفتاب

۱۸۲۴ د، رند، ۱ : ۴۰

لحد کمال عزیز و مقام وحشت ہے
اتارنا جو مجھے پہلے تم اتر لینا

۱۸۸۱ اسیر، د، ۵۷

اتارے دیتے ہیں لاشہ مرا کہاں احباب
یہ آسمان نہیں اس زمین کے قابل

۱۹۲۷ روح رواں، ۸۲

۴۔ آچکنا، الگ کرنا، توڑ لینا۔

تنور چرخ سے لیتے گر سنہ کب کے اتار
ذرا بھی لگتی اگر قرص آفتاب میں سیخ

۱۸۲۹ ک، ظفر، ۲ : ۳۷

تین تین چار چار پتّے ہر درخت پر سے اتارے۔

۱۹۰۷ رسالہ علم فلاحت، ۱۷۰

۵۔ (i) منہدم کرنا، ڈھانا۔ م : گرنے کے خوف سے میں نے دیوار اتار دی۔

(ii)۔ ساقط کرنا، گرانا (نظروں سے)۔

اشک افتادہ نظر آتے ہیں سارے دریا
سیل گریہ نے یہ نظروں سے اتارے دریا

۱۸۵۴ غنچۂ آرزو، ۱۸

چھوٹے بھائی نے نہ مانا مرا کہنا افسوس
مجھ کو ہم چشموں کی نظروں سے اتارا اے قیس

۱۹۲۸ مرقع لیلیٰ مجنوں (اشاعت رام نرائن)، ٦٦

٦ - تراشنا، قلم کرنا، کاٹنا (سرکا)۔

منگیا اس گھڑی سو سٹوں اس کوں مار
کرے پارچے دو، سر اس کا اتار

۱٦٣٩ طوطی نامہ، ۴۷

سب کے سر تن سے اتارے گئے۔

۱۸۴۵ نعمۂ عندلیب، ۳۰

تری شمشیر پُر خم نے ہزاروں سر اتارے ہیں
یہی تو گھاٹ ہے بحر محبت کے اتارے کا

۱۸۷۸ گلزار داغ، ۳۰

آپ میرا سر اتاریں گے کوئی بات بھی ہے
سر سے بارغم فرقت تو اتارا نہ گیا

۱۹۲۲ سنگ و خشت، ۳۵

۷ - (i) نازل کرنا، القا کرنا۔

خدا نے اَن پڑھ بدوؤں کے لیے ان ہی کی زبان میں قرآن اتارا ہے۔

۱۸۹۵ تہذیب الاخلاق (مضامین سرسید)، ۲: ۲۳۸

بھیجے پئے ہدایت مرسل بھی انبیا بھی
نازل کیے صحف بھی قرآن بھی اتارا

۱۹۲۵ عزیز، صحیفۂ ولا، ۲۱۵

(ii) مبعوث کرنا، نبی یا ہادی بنانا۔

امی لقب اس سے ہے کہ بھیجا ہے پڑھا کے
دنیا میں اتارا ہے رسول اپنا بنا کے

۱۹۵۱ آرزو، صحیفۂ الہام، ٦۲

۸ - (i) قیام کرانا، ٹھہرانا، مہمان بنانا۔

ایک اچھے مکان میں اتارا اور شرائط مہمانداری کی بجا لائیں۔

۱۸۰۱ داستان امیر حمزہ، اشک، ۲۱۸

نوکر چاکر اسی ملکہ کے، استقبال کر کر ایک مکان معقول میں اتارتے۔

۱۸۰۲ باغ و بہار، ۴۵

میں ایک شاہی قصر میں اتارا گیا۔

۱۹۱۳ تمدن ہند، ۲۹۳

جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اتارا۔

۱۹۳۲ سیرۃالنبی، ۲: ۸۳۸

(ii) - پذیرائی کرنا، سواری کو لپاک یا مدد کے طور پر ہاتھ کا سہارا دینا۔

تجھے ہوریس نے بگھی پر سے اتارا۔

۱۸۹۸ روزا لمبرٹ، ۹۰

۹ - کسی جگہ لے جانا، پہنچانا، پڑاؤ کرانا، لا ٹھہرانا۔

اتاری فوج گردا گرد دریا
کہ تا پاوے نہ پانی ایک قطرا

۱۸۳۸ ناسخ، شہادت نامہ آل نبی، ۴۴

آدم کو سراندیپ میں اتارا تھا۔

۱۸۷۳ تریاق مسموم، ۴

۱۰ - پیدا کرنا، وجود میں لانا۔

پرمیشر نے جیسے اسے دنیا کے پردے پر اتارا۔

۱۸۰۱ سنگھاسن بتیسی، ۲

۱۱ - (ذہن یا دماغ سے) برآمد کرنا، گھڑنا، اپج کی لینا۔

اس قسم کی افواہیں دماغ سے اتارتے ہیں۔

۱۹۱۹ کرشن بیتی، ۵۹

۱۲۔ ذہن نشین کرانا، دل میں بٹھانا۔

مذہب ایسی چیز نہیں، کہ مباحثے اور مناظرے سے کسی کے دل میں اتار دی جائے۔

۱۸۸۸ ابن الوقت، ۲۷۱

ان کی زبان میں یہ قدرت تھی کہ مضمون کو دل میں اتار دیتے تھے۔

۱۹۲۰ لخت جگر، ۱: ۳۶

۱۳۔ پیوست کرنا، داخل کرنا، گھونپنا، بھونکنا۔

نشتر کو اندر گہرائیوں میں اتارتا جاتا ہے۔

۱۹۳۵ حکیم الامت، ۲۵

۱۴۔ (جسم یا اس کے کسی حصے سے) الگ کرنا، جدا کرنا۔

قول کے چھلوں کی اللہ رے کافر کو خوشی
پہنے سو مرتبہ، سو بار اتارے، دیکھے

۱۸۳۴ د، رند، ۱: ۱۵۱

آمد فصل جنوں ہے تا کجا قید نماز
طوق گردن سے اتارا چاہیے محراب کا

۱۸۳۶ ریاض البحر، ۵

سادہ زیور پہنے ہو یا جڑاؤ، نہ اسے اتارے نہ اسے بڑھائے۔

۱۹۳۱ رسوا، خورشید بہو، ۷۹

ایک دن مجھے عینک اتارے ہوئے دیکھ کر بولیں ابا میاں آپ عینک اتار دیتے ہیں تو دوسرے کے ابا میاں معلوم ہوتے ہیں۔

۱۹۵۶ شیخ نیازی، ۸

۱۵۔ اکھاڑنا (چپکی ہوئی چیز کو)، چھڑانا، الگ کرنا۔

خورشید کو نہ کیوں کہ چڑھے تپ جو تفتہ دل
بھائے کو داغ دل سے اتارے علی الصباح

۱۸۵۴؟ ک، ظفر، ۳: ۳۳

تھانوں پر سے چٹھیاں اتاریں اور چٹھی کے نیچے موٹی موٹی تین چار سطریں لکھ دیں۔

۱۹۰۸ صبح زندگی، ۴۴

جب سلعہ کی کھال اتارنے میں شریان، عصب یا رگ کٹ جانے کا ڈر ہو۔

۱۹۲۷ جراحیات زہراوی، ۹۳

۱۶۔ کھانچے، چول یا جوڑ پر سے کھسکانا یا ہٹانا، جسم کا جوڑ الگ کرنا۔

زوروں پہ چڑھ چکا ہے ترا او نگار ہاتھ
مرجاں کرے کلائی تو اس کا اتار ہاتھ

۱۸۴۴ د، رند، ۲: ۲۷۱

پیچ نہ چلا، ہتھوے نے کلائی اتار دی۔

۱۹۳۰ اودھ پنچ، ۱۵: ۱، ۴

۱۷۔ (i) (کسی چیز کے اثر کو) رفع کرنا، زائل کرنا۔

ان کی لہر اتارنی اس کے آگے ایک بات تھی۔

۱۸۰۵ آرائش محفل، افسوس، ۲۸۲

نشے حسن کی کیا ہوئیں وہ ترنگیں
نشے رند نے سب اتارے تمہارے

۱۸۳۴ د، رند، ۱: ۱۲۹

نیولا'منگوس بیل نامی ایک پودے کی پتی کھا کر زہر کو اتار دیتا ہے۔

۱۹۳۲ عالم حیوانی، ۲۷۴

(ii) (کسی چیز کا) دفعیہ کرنا، دور کرنا۔

عشق اس پری کا ہے وہ بلا جائے لے کے جان
یہ جن نہیں ہے جس کو سیانا اتار دے

۱۸۵۴ ذوق، د، ۲۰۷

زندگی بھر تری زلفوں کا رہے گا سودا
سر سے یہ جن وہ اتارے گا جو عامل ہوگا

۱۸۹۳ معیار نظم، ۵۰

۱۸ - برطرف کرنا، معزول کرنا۔

سلطان عبدالعزیز کو وزرا اور شیخ الاسلام نے بے وجہ تخت سے نہیں اتارا۔

۱۸۸۰ فسانۂ آزاد، ۲: ۲۹۹

۱۹ - (سر یا آواز کا) پست کرنا، دھیما کرنا۔

خدا کے لیے یہ بھی ایمان ہے یارو
بہت چڑھ گئے سُراب ان کو اتارو

۱۸۹۶ تجلیات عشق، اکبر، ۲۲۸

۲۰ - اوپر کے درجے یا جماعت سے نیچے کے درجے میں لانا، تنزل کرنا، م: اسے تیسری سے دوسری میں صدر مدرس نے اتارا تھا۔

۲۱ - دبلا بنانا، نحیف کرنا، (چہرے کا)

چڑھانا ضعف میں مانی کا کب سر پر گوارا ہے
تپ غم نے ترے بیمار کا چہرہ اتارا ہے

۱۸۵۸ امانت، د، ۸۸

۲۲ - کھچاؤ کم کرنا، ڈھیلا کرنا م: ریاض کے بعد طنبورے کے تار اتار دیے۔

۲۳ - بے وقعت کرنا، پست و خوار بنانا۔

اشک افتادہ نظر آتے ہیں سارے دریا
سیل گریہ نے یہ نظروں سے اتارے دریا

۱۸۵۴ غنچۂ آرزو، صبا، ۱۸

۲۴ - نگلنا، پینا، کھانا۔

جو پانیچ حلق میں ہل گیا، اسے کوئی کاہے سوں اتارے۔

۱۶۳۵ سب رس، ۲۱۵

یہ اپنے شکار کو ہمیشہ سارے کا سارا اتار جاتا ہے۔

۱۸۶۹ اردو کی تیسری، آزاد، ۶۷

نہ پوچھ میں نے جو زہرابۂ حیات پیا
کوئی اتار لے اس کو تو ہڈیاں اڑجائیں

۱۹۵۹ گل نغمہ، ۴۲۹

۲۵ - (پردے وغیرہ کا) لٹکانا، اوپر سے چھوڑنا۔

پھولاں سوں سیج سنوارے، چھپر پلنگ کا پردہ اتارے۔

۱۶۳۵ سب رس، ۲۷۲

۲۶ - داغنا، سر کرنا، نشانے پر پہنچانا۔

ترک گولہ اندازوں نے چار گولے ایسے اتارے کہ ایک قلعے کے برج کو ڈھادیا۔

۱۸۸۰ فسانۂ آزاد، ۲: ۳۶۰

۲۷ - تیار کرنا، مکمل کرنا، پکا کر چولھے

یا آگ پر سے ہٹانا، سانچے مشین وغیرہ سے بنا کر نکالنا۔

چاول پک چکے ہیں، نیچے اتار کر رکھے ہیں۔

۱۸۶۹ اردو کی پہلی کتاب، آزاد، ۳۹

جب سب گل جائیں تو خوب چمچہ ہلاہلا کر اتار لو۔

۱۹۰۶ نعمت خانہ، ۱۰۰

۲۸۔ ادا کرنا، بے باق کرنا، چکانا (قرض وغیرہ)۔

بوسے اس رخ کے لیے گن کے اس عارض کو دیے
قرضۂ حسن اتارے سے سوا ہوتا ہے

۱۹۲۵ نادان دہلوی، (ق)

۲۹۔ (ذمہ داری سے) سبکدوش ہونا، (قرض) پورا کرنا۔

(ایک تلی اروی کھا کر) لے قسم ہم نے اتار دی۔

۱۸۹۳ پی کہاں، ۳۱

پار اتارنا کیسا یار سر آتار آیا

۱۹۵۵ یاس، گنجینہ، ۹۱

۳۰۔ (کسی عبارت کو) نقل کرنا، ایک کاغذ سے دوسرے کاغذ پر منتقل کرنا۔

دو اخباروں کی نقل اتاری جاتی ہے۔

۱۹۰۷ کرزن نامہ، ذکاء اللہ، ۲۲۰

۳۱۔ عکس لینا، تصویر کھینچنا۔

یہ نور عکس رخ یار سے ہوا حاصل
کہ اپنے سینے میں آئینے نے اتارا چاند

۱۸۶۲ نسیم دہلوی، د، ۱۳۹

دل میں سکت نہیں کہ اس وقت کی حالت کا نقشہ ذرا [illegible] سکے۔

۱۹۲۱ فغان اشرف، ۵۰

میرا دل چاہتا ہے کہ شہزادی بیگم کی تصویر [illegible]۔

۱۹۶۰ [illegible] رنگ محل، ۳۷

۳۲۔ چربہ اٹھانا، کاغذ کو چرب کر کے نقل لینا، خاکہ کھینچنا، چھاپا لینا، چھاپنا۔

[illegible] کی خوبصورت [illegible] کی یہ [illegible] تصویریں سر ورق پر [illegible] چربہ [illegible] دیتے ہیں۔

۱۹۳۰ اودھ پنچ، ۱۵: ۹۰۲

۳۳۔ وارنا، قربان کرنا، صدقہ کرنا۔

پھسلا ہے میرے تصور میں [illegible] آپ کا
صدقے کے سر اتارے آج اپنے سر سے آپ

۱۸۳۶ ریاض البحر، ۴۷

سپارے ہوں اسپند جو سارے تو بجا ہے
تاروں کو فلک ان پہ اتارے تو بجا ہے

۱۸۷۴ انیس، مراثی، ۲: ۲۴۵

بٹھا کے پاس جو زلف رسا سنوارتی ہیں
بلائیں لے کے پھوپھی سر سے سر اتارتی ہیں

۱۹۱۷ گلزار رشید، ۷۶

۳۴۔ (عزت کے ساتھ سر وغیرہ پر) لینا، چڑھانا، رکھنا۔

سورج اترا آسماں تھے اس سبب آتا ہے شام
جو ترے نعلین (پا؟) کوں لیوے مکھ اوپر اتار

؟۱۶۷۸ غواصی، ک، ۵۰

۳۵۔ (دریا وغیرہ سے) عبور کرانا، لنگھانا۔

جوش کو پار اتارے گا تری تیغ کا گھاٹ
بحر الفت کا یہی ایک ہے ساحل قاتل

۱۸۷۰ چمنستان جوش، ۴۷

۳۶ ۔ چھیننا، لے لینا (محروم یا بے آبرو کرنے کے لئے)۔

دوسرے کے سامنے عزت کیوں اتارتا ہے ۔

۱۹۰۹ خوبصورت بلا، ۱۲

۳۷ ۔ (سوار کراکے) پہنچانا م : سواریاں اتار آئے۔

۳۸ ۔ (مقابلے کے لیے) میدان میں لانا۔

استاد نے دم خم دیکھ کر چوتھے ہی سال میں میلے کی گھوڑ دوڑ میں اتار دیا ۔

۱۹۶۲ اردو نامہ، ۱۲: ۱۹

۳۹ ۔ گھٹا کر اعتدال پر لانا، شدت کو کم کرنا م: یہ دوائیں منٹوں میں بخار اتار دیتی ہیں۔

۴۰ ۔ جاری کرنا ، رواں کرنا م : دودھ اتارنے والی دوائیں ۔

اَتارُو (ضم ا، و مع) صف مسند

۱ ۔ کسی کام یا چیز پر آمادہ ، مستعد، تلا ہوا ۔

یہ عورت پچیس برس سے اس گھر میں تھی اور ہمیشہ لوٹنے پر اتارو تھی ۔

۱۸۶۸ مرآۃ العروس، ۱۲۴

جب آستیں چڑھائی زلفیں سنوارنے پر
وحشت ہوئی اتارو کپڑے اتارنے پر

۱۸۷۶ سخن بے مثال، ۳۹

یہ جھگڑے پر اتارو ہو تو اس کو کوئی کیا قایل کرسکتا ہے ۔

۱۹۰۵ لیکچروں کا مجموعہ، ۲: ۱۹۳

دوسرے وہ جو کھلم کھلا بدکاری پر اتارو ہوجاتی ہیں۔

۱۹۳۱ رسوا، امراؤ جان، ۲۱۲

۲ ۔ اتارنے والا، پار لگانے والا (قدیم)۔

عجب یک درد منج ہے دارو نہیں
سمد پور ہے ہور کوئی اتارو نہیں

۱۶۰۹ قطب مشتری، ۳۱

اس درد کا دارو، سو تو نچھ ہے، اس دریا کا اتارو سو تو نچھ ہے ۔

۱۶۳۵ سب رس، ۱۱۹

اف : ہونا

[ا : اُتار + و (لاحقہ فاعل) س: ــَــ ک]

اَتاق (ضم ا) امذ، اوتاق ۔

خیمہ، ڈیرا، کمرا، کوٹھری۔

شاہی مہمان سمجھ کر اوتاق شاہی میں ٹھہرایا گیا۔

۱۹۳۰ آغا شاعر، لیلیٰ دمشق، ۳۲

[ت: اوتاغ]

اَتاقا (ضم ا) امذ

کلغی، کیس، سر کے اوپر کے بال، ٹوپی کے پر ۔

تری گھر کی جاروب اے شاہ خوباں
مرے واسطے ہے ھما کا اتا قا

١٨٧٣ نشید خسروانی، نواب، ١٣

[رک: آتاق]

اتال (کس ا) ظرف (قدیم)

اب، اس وقت، ابھی۔

ادا یوں اتال ہوئے تو کیا عجب
کہ عالم سنیا ہے یو چوپھیر سب

١٦٠٩ قطب مشتری، ١٦

عاشق ترے جمال پہ شیدا ہوئے اتال
وہ دل میں آئینہ سوں مصفا ہوئے اتال

١٧٠٧ ولی، ک، ٣٢٢

وگر نیں تودے مجھ کو کسب حلال
مرے پر تو کر اس آساں تال

١٧٧١ هشت بہشت، ٥: ٦٣

[س: اے تد + کال = یہ وقت]

اُتالا (ضم ا)

(الف) صف ا۔ رک: "اتاولا"

اوتالا نکو ہو کہ تج زبان ہے
اوتالا کرن ھار نادان ہے

١٦٢٥ سیف الملوک و بدیع الجمال، ٢٢

عاشق اتالا بہوت گرم، معشوق کوں حائل ہوتی شرم۔

١٦٣٥ سب رس، ٩٢

٢۔ بے چین، بے قرار۔

مجھے اس کدن سوں شتالا ھوا
اتا جیو میرا اتالا ھوا

١٦٨٢ رضوان شاہ و روح افزا، ٦٠

٣۔ (مجازاً) مشتاق۔

منج من اتالا ہے ادک اے ذرنج سنگرام کا
لٹ پٹ ہوا ت پیم سوں منج د،تہہ کے گسہار حذ

١٦١١ قلی قطب شہ، ک (غزلیات)، ١٠٥

(ب) امذ، ۴۔ رک: "اتاولی" (الف)

اوتالا نکو ہو کہ تج زباں ہے
اوتالا کر نہار نادان ہے

١٦٢٥ سیف الملوک وبدیع الجمال، ٢٣

کہ جو کام ہوتا اچھے صبر سوں
اتالا نہ کرنا اسے جبر سوں

١٦٣٩ طوطی نامہ، ١٢٠

اُتالی (ضم ا) امث (قدیم)

١۔ بے چینی، بے قراری، بے صبری۔

جوں اس تھے سنیا شاہزادہ یو بات
اپن دل کوں دے پھر آتالی کے ہات

١٦٢٥ سیف الملوک وبدیع الجمال، ٥٣

ولے دل میں اٹھی اوس کے اوتالی
سمجھنے اوس نہ دی اپسیں سنبھالی

١٦٦٥ پھول بن، ٥٨

٢۔ (مجازاً) اشتیاق، شوق۔

تمن بن دیس منج نس ہے، تمن سوں رین منج دن ہے
کھڑی اک پانوں پر جوں سرو ملنے کی اوتالی میں

١٦١١ قلی قطب شاہ، ک (غزلیات)، ١٩٥

۳ ۔ جلدی، عجلت ۔ م : کسی کام میں اتالی نہ کرو ۔

[رک: اتاولی]

اَتالیق (فت ا ، ی مع) امذ اتالیغ ۔

۱ ۔ معلم، اُستاد، اخوند، ادب آموز ۔

خوب جو کچھ اٹھا خزینے ہے
لو اتالیق کے مہینے ہے

۱۷۸۰ سودا، ک، ۱ : ۳۸۵

معلم اتالیق منشی ادیب
ہر اک فن کے استاد بیٹھے قریب

۱۷۸۴ سحرالبیان، ۲۸

خود وہ اپنا اتالیق ہوجاتا ہے ۔

۱۸۳۶ بستان حکمت، ۴۲

سب سے پہلا مدرسہ سمجھو، اتالیق سمجھو، جو کچھ بھی ہے، ماں کی گود ہے ۔

۱۹۰۸ صبح زندگی، ۵۴

۲ ۔ نگراں کار، خبر گیراں (امیر زادوں کا)۔

ایک امیر کی طرف جو اس کا اتالیق تھا اشارت کی کہ اس کے سوا کوئی اس کی صورت سے واقف نہیں ۔

۱۸۰۳ گل بکاولی، ۴۳

محمد قاسم خان برلاس کو اس کا اتالیق مقرر کیا۔

۱۸۹۶ تاریخ ہندوستان، ۵ : ۱۱

ہم اتالیق ہیں تو ظاہر و باطن، اندر باہر کی نگرانی ہمارا فرض ہے ۔

۱۹۲۸ اودھ پنچ، ۱۳ : ۱۷، ۳

اگر کہو تو تم کو اس لڑکے کا اتالیق بنا کر بھیجنے کے لئے کہہ دوں ۔

۱۹۲۷ فرحت، مضامین، ۲ : ۵۷

۳ ۔ نج کا استاد، ٹیوٹر ۔

دونوں استاد اتالیق تھے ہمراہ آئے
باندھ کر دست ادب رو بروئے شاہ آئے

۱۸۹۷ نظم آزاد، ۷۷

[ت: اتالق : اَتا (= سردار ، بزرگ) + لِق (لاحقۂ اسم کیفیت)]

اَتالیقی (فت ا ، ی مع) امث

۱ ۔ تعلیم و تربیت، ادب آموزی ۔

بڑے بڑے دانا استاد ہر ایک علم اور کسب کے چن کر میری اتالیقی کے لئے مقرر کیے تھے ۔

۱۸۰۲ باغ و بہار، ۶۷

سلطان معز الدین کو . . . غلام علی خان کی اتالیقی میں اس کے پاس روانہ کیا

۱۸۴۷ حملات حیدری، ۵۸۸

اول مناصب ولا . . . شاہزادوں کی اتالیقی، امیر الامرائی . .

۱۸۹۶ تاریخ ہندوستان، ۵ : ۴۰۲

مرشد زادوں کی اتالیقی . . . تفویض ہوئی۔

۱۹۲۶ حیات فریاد، ۸۸

۲ ۔ معلمی، اُستادی کا پیشہ ۔

ایک نوجوان لڑکی جو خاصی تعلیم یافتہ ہے . . . اتالیقی قبول کرتی ہے ۔

۱۹۳۸ اقبال، اقبال نامہ، ۱ : ۳۱۷

[ت: اتالیق + ا : ی (لاحقۂ اسم کیفیت)]

اَتانا (ضم ا) صف، اُو' تانا

۱ ۔ الجھا، پیچ دادہ ۔

ہر ایک کی جان کا سوت اوتانا ہوا (الجھا)، تو کہیں میں کہیں ۔

۱۹۳۲ اودھ پنچ، ۱۷ : ۱۷، ۱۰

۲ ۔ چت، با آرام (قدیم) ۔

کبھی رکھ وہ یک پانْوں دسرے اپر
اتانا ہو لیٹا ہے اے با خبر

۱۷۷۱ ھشت بہشت، ۵ : ۸۲

[س: آتّان (آد + تن) = پھیلا ہوا]

اَتاوَر (ضم ا، فت و) صف (قدیم)

بے چین، بے قرار، (مجازاً) مشتاق ۔

یو باتاں منے دیس آخر ہوا
جگت سب سورج کا اتاور ہوا

۱۶۸۲ رضوان شاہ و روح افزا، ۶۰

[ا: آتاور < آتاول < آتاولا]

اَتاوَل (ضم ا، فت و) (الف) ۔ امث (قدیم) ۔

۱ ۔ جلدی، تیزی ۔

ترا مال ہے توں اتاول نہ کر
جھٹے اتنے کوں اپسے باول نہ کر

۱۶۰۹ قطب مشتری، ۹۷

(ب) صف

۲ ۔ بے قرار، بے چین ۔

جکوی پاک عاشق ہے باول نہیں
وو سنگین ہے کچ اوتاول نہیں

۱۶۳۵ سیف الملوک و بدیع الجمال، ۱۳۷

اپس کوں باول نہ کرنا اتاول نا کرنا ۔

۱۶۳۵ سب رس، ۱۹۷

[رک: '' آتاوْلا '']

اَتاوْلا (ضم ا، سک و) صف، مذ

۱ ۔ جلدی کرنے والا، جلد باز ۔

یو ناگ اتاولا او ناڑے
یو دھڑے او جابجا بھڑاڑے

۱۷۰۰ من لگن، ۱۲۵

۲ ۔ متلون مزاج ، ایک بات پر نہ ٹکنے والا، سیماب پا ۔

اور مانگتا ہے آدمی برائی جیسے مانگتا ہے بھلائی اور ہے آدمی اتاولا ۔

۱۷۹۰ ترجمۂ قرآن، شاہ عبدالقادر، ۲۵۸

[: آتّاوَلَ (= جلد باز) قدیم ھند آریا : آتّا پل (اتاپ = آد + تپ)]

اُتاوْلی (ضم ا، سک و) امث

جلدی، عجلت ۔

لے جانے کی بیگی اوتاولی کیے
لے جاکر دیکھوں کیا خرابی کیے

۱۷۱۹ جنگ نامۂ عالم علی خاں، ۵۲

[ا: اتاول ← ی (لاحقۂ اسم کیفیت)]

اَتاہ (فت ا) صف، رک: "اتھاہ"

شیو نے بڑے سور کی صورت میں اوتار لیا اور اتاہ پانی میں کُودا۔

۱۸۹۹ معارف (حیدرآباد)، اپریل، ۲۹۲

آج مایوسی اور غم کے اتاہ ساگر میں ڈوبتے ہوئے اُنہوں نے اسی تنکے کا سہارا لیا۔

۱۹۲۶ پریم چند، خاک پروانہ، ۱۶۷

اَتائی (فت ا، ی مع) عطائی

(الف) امذ

۱۔ جو شخص کسی فن ، ہنر یا علم کو باقاعدہ حاصل نہ کرے اورسرسری مطالعے یا معمولی تجربے کی بنا پر اس میں دخل دے، نا واقف فن، بے استادا۔

اس طرح ادا کروں، اتائی کیا کسی اچھے گویے سے بھی نہ ہوسکے۔

۱۸۸۰ فسانۂ آزاد، ۳: ۹۹۰

کلاونت ہوگا تو ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ اتائی ہے۔

۱۹۱۰ آزاد، مقدمۂ دیوان ذوق، ۲۲

۲۔ علاج معالجے میں تھوڑا سا دخل رکھنے والا، نیم حکیم۔ م : کسی اتائی کا علاج کیا ہوگا۔

(ب) صف

۳۔ عامی کا تجویز کردہ، اتائی سے منسوب

م : اتائی نسخوں سے بھی بڑا فائدہ دیکھنے میں آیا ہے۔

[س: آتم ادھیت (آتم = خود + ادھیت = مطالعہ کرنے والا)؛ یا س: آتمی ی، پ: آتائی]

اَتبار (فت ا، سک ت) مف۔ رک : اَتبران

کہیا جاکے اتبار یوں بول اسے
کہ آیا ہے توں دھنڈ لیتا جسے

۱۶۲۵ سیف الملوک وبدیع الجمال، ۱۵۷

نہ کر سوں آج تھے رندی نہ پی سوں مدک پیالی کر
کیا تھا اتنی براں توبہ ولے اتبار نا کر سوں

؟۱۶۷۸ عواصی، ک، ۱۲۷

اَتباع (فت ا، سک ت) امذ

۱۔ مقلدین، پیرو، کسی امام فن یا مذہبی پیشوا کی تقلید کرنے والے۔

کہا شہ نے اتباع احمد سے ہوں
کہ آگاہ شرع محمد سے ہوں

۱۸۲۰ معارج الفضائل، ۱۷۶

امام ابو حنیفہ کے اتباع اہل الرائے و القیاس کہلاتے ہیں۔

۱۸۸۵ جامع الاحکام، ۱: ۲۲

فیثا غورس اور اس کے اتباع ثابت کرتے تھے افلاک میں ہوا اور اس کا نکلنا وہاں سے۔

۱۹۲۵ حکمۃ الاشراق، ۲۲۷

۲ ۔ لواحق، متعلقین (جو کسی کی کفالت میں ہوں) ۔

تمامی اتباع اور لواحق کو حکم کیا اس کے فرماں بردار رہیں ۔

۱۸۲۶۰ بستان حکمت، ۲۷۲

نبی کی سورۂ کوثر میں روداد
بیان کثرت اتباع و اولاد

۱۸۵۵ ریاض المسلمین، اسیر، ۲۷

بجز خورشید نواب صاحب اور ان کے اتباع کے اور کوئی نہ تھا ۔

۱۹۲۷ شاد، مکتوبات، ۲۶

مع اپنے اتباع و اولاد کے علاء الدین کے غلاموں کے ہاتھ سے . . . مخذول اور قتل ہوا ۔

۱۹۳۹ افسانۂ پدمنی، ۸۳

۳ ۔ تابعین، رسول اللہ کو دیکھنے اور ان سے ملاقات کرنے والے ۔

بعد اس کے تابعین اور ان اتباع تبع پر کہ نادیدہ شوق لقائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جان عزیز دیتے ہیں۔

۱۸۴۵ احوال الانبیا، ۱: ۱۳

[ع: تَبَع (فت ت، ب) کی جمع بروزن اَفعال]

اِتّباع (کس ا، شدت بہ کس) امذ نیزا مث

۱ ۔ اطاعت، فرماں برداری۔

رسول مقبول کے اتباع و اطاعت کو . . . مقدم جان کر سب کام دین و دنیا کے شریعت نبوی کے موافق کرتے رہیں ۔

۱۸۳۰ تقویتہ الایمان، ۲۶۷

حضرت دانیال علیہ السلام بہ سبب عدم اتباع امت خفا ہو کر پہاڑ پر جا بیٹھے ۔

۱۸۸۰ تذکرۂ غوثیہ، ۲۷۷

برا ہو اتباع نفس و حب زال دنیا کا

۱۹۲۳ نظم طبا طبائی، ۳

۲ ۔ پیروی، تقلید ۔

ہے کون جزائمہ اثنا عشر بہ خلق
انشا امور دیں میں کرے جس کی اتباع

۱۸۱۸ انشا، ک، ۲۷

آنے والی ہے وہ ساعت جب کریں گے اتباع
کابل و ہند و عراق و مصر و شام انگورہ کا

۱۹۳۱ بہارستان، ۳۵۷

اعلیٰ حکومت کی اتباع میں بطور سنت، سکرٹری اور ایڈی کانگ رکھنا بھی داخل فیشن ہو گیا ہے ۔

۱۹۲۵ اودھ پنچ، ۲۰: ۸، ۳

۳ ۔ اختیار، عمل۔

ان کا روزہ اتباع رسم کے طور پر ہوتا ہے ۔

۱۸۹۱ ایامیٰ، ۹۵

ایک شخص اتباع سنت چاہتا ہے، تم اس کی نسبت کہتے ہو کہ وہابیوں کی سی باتیں کرتا ہے ۔

۱۹۰۱ حیات جاوید، ۳: ۱۲

اتباع صفات والا سے
باعث فخر خاندان تم ہو

۱۹۲۲ زخ ش، فردوس تخیل، ۲۹

[ع: مصدر (ت ب ع) بروزن اِفتِعال]

اُتْبَراں (فت ا، سک ت، فت ب) مف

اس کے بعد، زاں بعد۔

بسر گئی میں وو بات کچ یاد نیں

کنا اتبراں جو دھروں یاد نیں

۱۶۳۹ طوطی نامہ، غواصی، ۲۲

[س : اَتْ پَرم (= اَتس = اس سے + پرم = بعد) = اس کے بعد۔]

اُتپت (ضم ا، سک ت، فت پ) امذ (قدیم)

پیدائش، خلق، وجود۔

اوس کی قدرت میں کچ مشکل نیں کہ اس کے من سنگھار و من میں اتپت۔

۱۵۸۲ برہان الدین جانم، کلمۃ الحقائق، ۳۰

[س: اُتْ پَتّ = پیدائش]

اُتپن (ضم ا، سک ت، فت پ) امذ نیز امث

رک: **"اُتپت"**

یو تو نجس او پلید ہے پن

اس دو سوں ہے آدمی کی اتپن

۱۴۰۰ من لگن، ۴۵

اب جکچھ ہے سو نہ ماٹی ہے نہ من ہے نا پران

تھا امانت نگ سو اپنے وقت پر اتپن ہوا

۱۷۱۷ بحری، ک، ۱۲۲

۲۔ پیداوار، منافع۔

۳۔ کسی گاؤں کا لگان۔

اف : **ہونا**

[س: اُتْ پَنّ = مخلوق، پیدا شدہ۔]

اُتّنا (ضم ا، سک ت) آتّا

رک: "آتنا"

جتنا سکے گا اتنا دوستی سوں کام کر۔

۱۶۳۵ سب رس، ۲۶۱

اِتّنا (کس ا، سک ت) اتّا

رک: "اِتنا"

اِتّحاد (کس ا، شدت بہ کس) امذ

۱۔ وحدت، واحدیت، دو یا دو سے زیادہ کا مل کر ایک ہونا۔

وصل ہو یا ہجر حق میں اس کے دونوں ایک ہیں

آبرو کوں ہو گیا ہے یار سیں اب اتحاد

۱۷۳۳ آبرو، د (ق)، ۱۷

کہتی ہے صاف عقل کہ ایسا نہیں خدا

بہتاں ہے اتحاد کا تہمت حلول کی

۱۸۷۲ محامد خاتم النبیین، ۱۱۲

عیسائی خدا کی اُبوت اور حلول و اتحاد کے قائل ہیں۔

۱۹۰۶ الکلام، ۲ : ۷۵

۲۔ یکسانی، مطابقت، دو یا دو سے زیادہ افراد یا اشیا کی کسی صفت میں شرکت۔

پانی میں بھی کیفیت ایسی ہی کچھ دیکھی جاتی ہے، ہر چند کہ جنس میں اتحاد رکھتا ہو۔

۱۸۰۵ آرائش محفل، افسوس، ۱۱

صورت میں اتحاد تو سیرت میں اختلاف
تجھ سا ہو اور تجھ سا نہ ہو وہ بشر کہاں

۱۸۷۸ گلزار داغ، ۱۳۳

۳ - اتفاق، ایکا .

اسلامی فرقوں کا اتحاد بھی ہندو مسلمانوں کے اتحاد سے کچھ کم دشوار نہیں ہے ۔

۱۹۱۲ حالی، مکاتیب، ۵۳

اسلامی ممالک میں . . . اتحاد اور ہمدردی قائم رکھنے والی . . . ایک عربی زبان بھی ہے ۔

۱۹۳۵ چند ہم عصر، ۷۱

۴ - قرب، یکجائی، ہم نشینی ۔

تعلیم اتحاد کریں وہ تو ہوں بہم
ہر چند منزلوں ہے فلک سے جدا فلک

۱۸۷۲ محامد خاتم النبیین، ۲۷

۵ - میل جول، خلا ملا، ملاپ ۔

ہمت کا امداد ہے عشق کا اتحاد ہے ۔

۱۹۳۵ سب رس، ۱۰۶

بڑھتا نہیں ہے ناقۂ لیلیٰ جو نجد سے
مجنوں کا اتحاد ہوا سار باں سے کیا

۱۸۷۸ ک، صفدر، ۵۸

چند روز میں اس نے اس قدر اتحاد بڑھایا ۔

۱۸۹۲ عمر و عیار کی سوانح عمری، ۱۶۸

شیخ جمال الدین ہانسوی سے نہایت اتحاد تھا ۔

۱۹۰۵ سیداحمد، یاد گار دہلی، ۱۸۸

۶ - محبت، پیار ۔

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

۱۸۱۰ میر، ک، ۲۲۸

مالوف یار مجھ سے میں شیدائے یار ہوں
مشتاق ہم دگر ہیں دو دل اتحاد ہے

۱۸۴۶ آتش، ک، ا : ۱۸۹

دونوں کو اتحاد نے اک رنگ کر دیا
کھلتا نہیں کہ یار ہے یا پیرہن ہیں ہم

۱۸۹۶ تجلیات عشق، ۱۴۲

III ۷ - اعتدال، سازگاری، باہمی موافقت.

ڈالا تھا آب تیغ نے ہر جسم میں فساد
موقوف تھا عناصر اربعہ کا اتحاد

۱۸۷۴ انیس، مراثی، ۲: ۱۴۴

۸ - (تصوف) خدا کی ہستی میں سالک کا استغراق یا وجود مطلق کا اس طرح مشاہدہ کہ اس میں اور موجودات میں غیریت نظر نہ آئے۔

[ع: مصدر (و ح د) بروزن اِفْتعال == ایک ہونا]

اتحادی

(کس ا ، شدت بہ کس) (الف) صف

۱ - اتحاد کی طرف منسوب، اتحاد والا ۔

تین دن روزہ رکھوا کر اتحادی توجہ دی ۔

۱۸۸۰ تذکرۂ غوثیہ، ۲۱

اتحادی انجمن ہے جسم روح جسم تو

۱۹۲۲ ز - خ - ش، فردوس تخیل، ۱۶

بکھرے ہوئے کو باندھے زنجیر اتحادی

۱۹۲۷ عظمت اللہ خاں، سریلے بول، ۸۷

(ب) امذ

۲ ۔ حلیف، (لوگ یا قومیں) جنہوں نے صلح و جنگ میں ایک دوسرے کی امداد کا معاہدہ کرلیا ہو۔

۳ ۔(سابقہ عالمگیر جنگوں میں) جرمنی وغیرہ کے خلاف لڑنے والی بڑی طاقتوں کا مجموعی لقب۔

ہندوستان کی طرف سے چند آدمیوں کا ایک وفد انگلینڈ اور یورپ کے دوسرے اتحادی ملکوں میں بھیجا جائے۔

۱۹۲۰ برید فرنگ (مقدمہ)، ۱۰

ترکوں پر اتحادیوں کا نرغہ ہوا۔

۱۹۲۳ مضامین، عبدالماجد دریا بادی، ۱۹۷

[ع: اتحاد + ی (لاحقۂ نسبت)]

اِتحاف (کس ا، سک ت) امذ

تہدیہ، پیشکش، تحفہ دینا۔

اتحاف و اہدا تکلف محض ہے۔

۱۸۶۹ غالب، خطوط، ۲۲۲

کون سا میوہ قابل اتحاف رئیس عالی مرتبت ہوتا ہے۔

۱۹۰۰ مکاتیب امیر، ۲۲۶

[ع: (ت ح ف) بروزن اِفعال]

اُتر (ضم ا، فت ت)

۱ ۔ "اترنا" کا حاصل مصدر، مرکب مصادر میں مستعمل، جیسے: اتر آنا، اترجانا، وغیرہ (رک)

۲ ۔ "اترنا" کی جگہ اور اس کے معنوں میں (متروک)

طبیب عشق یہ کہتا ہے ہجر کی تپ کو
کہ چڑھ تو آتا ہے اس کو اتر نہیں آتا

۱۹۲۵ شوق قدوائی، د، ۵۲

[پا: اُوتَرَت، س: اَوَتَرَت (اَو + تَر) == اوپر سے نیچے آنا ہے۔ یا س: اَتَّرت == عبور کرنا ہے۔]

ـــآنا فل

۱ ۔ (اعلٰی درجہ چھوڑکر پست تر درجہ) اختیار کرنا، بہ‌طریق تنازل کوئی کام کرنا۔

اب اتر آئے ہیں وہ تعریف پر
ہم جو عادی ہوگئے دشنام کے

۱۹۰۵ یادگار داغ، ۸۴

آج کل کے با کمال اس کا خیال نہیں کرتے، گلے بازی پر اتر آتے ہیں۔

۱۹۳۵ چند ہم عصر، ۱۹۱

چاوڑی کو چھوڑ کر چاندنی چوک کی تعریف پر اتر آیا ہے۔

۱۹۲۷ فرحت، مضامین، ۳: ۲۷

۲ ۔ آتارو ہونا، تل جانا۔

مذہبی بحث ہی اچھی نہیں، ضرور ہے دو بحث کرنے والے سخن پروری پر اتر آئیں جس کا انجام ہے گالی گلوچ۔

۱۹۰۶ الحقوق و الفرائض، ۲: ۳۶۲

۳ ۔ حملہ آور ہونا، دھاوا بولنا۔

روبی لوگ حلب پر اتر آئے تھے۔

۱۸۴۷ ترجمۂ ابوالفدا، کریم الدین، ۳۳۸

باقی معانی کے لئے رک: **"اترنا"**

—پڑنا رک: **"اترنا" جس کی یہ تکمیل ہے۔**

—جانا رک: **"اترنا" جس کی یہ تکمیل ہے۔**

—کر مف

—کے **(مقابلۃً) کم یا پست، کمتر، پست تر۔**

قسم اول نور تیرے عارض تاباں میں ہے
اس سے کم سورج میں ہے، اس سے اتر کے چاند میں

۱۸۶۷ رشک، د، ۱۹۴

بازار جہاں میں دُر یکتائے عدن کی
ہے قدر مگر اشک کے گوہر سے اتر کر

۱۸۷۵ مونس، مجموعۂ مرثیہ، ۲: ۲۷

شاہ جہاں کے دربار میں سب سے بڑا منصب نُہ ہزاری تھا ... اس سے اتر کر ہفت ہزاری۔

۱۹۱۴ شبلی، مقالات، ۱: ۲۲۶

—گئی لوئی تو کیا کرے گا کوئی (کہاوت)

انسان بے حیائی اختیار کرلے تو کسی کا خوف نہیں رہتا، جب عزت اتر جاتی ہے تو انسان نڈر ہوجاتا ہے۔

اُتّر (ضم ا، شد ت بہ فت) امذ

۱۔ نکلتے سورج کی طرف منہ کرکے کھڑے ہونے پر بائیں طرف کی سمت، سمت شمال۔

آدھی رات کو شہر سے کوچ کیا اور اتر کی سمت چلا۔

۱۸۰۲ باغ و بہار، ۲۲۴

دکھن، اتر، پورب، پچھم، ہنگامہ ہے سب جاگہ
اودھم میرے حرف و سخن نے چاروں اور مچایا ہے

۱۸۱۰ میر، ک، ۸۲۱

اتر والے کمرے کو خلوت خانہ فرمایا کرتے ہیں۔

۱۸۷۷ توبۃ النصوح، ۲۳۷

خرچ سے ہاتھ اک مسلماں کا ہو گر اتر میں تنگ
ہے دکن کی سمت وہ گردن اٹھا کر دیکھتا

۱۹۱۴ حالی، د، ۱۷۲

۲۔ جواب۔

زیبندہ ہے اس کے پگ میں چیہر
ٹھہراتی سوں سب کو دیتی اتر

۱۷۱۳ فائز دہلوی، د، ۲۱۹

اس نے اتر دیا کہ بھرتری کو کوئی یہاں سے چھل کر لے گیا۔

۱۸۰۱ سنگھاسن بتیسی، ۱۷

خوب چُبھتا ہوا دیا اتر
جس کی لاٹھی پڑی اسی کے سر

۱۹۲۱؟ پتنی پرتاپ، ۱۷

[س: اُتّر = جواب، پیچھے]

—جاؤ کہ دکھن وہی کرم کے لکھن (لچھن) کہاوت

تقدیر ساتھ نہ دے تو سفر وسیلۂ ظفر نہیں ہوتا، کہیں جاؤ کہیں رہو بدنصیبی برابر ساتھ لگی رہتی ہے۔

اِترا (کس ا، سکت) رک: "ایترا"

یہ ملکہ نے تھا چھیڑنے کو کہا
مرے پیچھے اترے توکیوں پڑ گیا

۱۸۷۱؟ لذت عشق، ۲۱

[پا: اتّر، پ: اُتر س: اتَر (= نیچ)،
وید ک: اُتوَر (ا = جانا) = چلنے والا]

—پن رک: "اتراہٹ"

امیر زادوں میں غرور، تبختر اور اتراپن زیادہ ہوا کرتا ہے۔

۱۹۲۶ شرر، مینا بازار، ۴۷

[اترا + پن (لاحقۂ اسم کیفیت)]

اُترا (ضم ا، سک ت) "**اُترنا**" کا حالیۂ تمام۔

—**باجا** امذ

(باجا) جس کے تار یا پردے وغیرہ ڈھیلے پڑ گئے ہوں۔

—**پن** امذ

دبلا پن، اضمحلال۔ م:

چھپاؤ مت کہے دیتا ہے سب چہرے کا اتراپن
کہیں تو رات کو جاگے ہیں صاحب کیوں مکرتے ہیں

۱۸۰۵ دیوان ریختہ، رنگین، ۹۷

[ا: اترا + پن (لاحقۂ اسم کیفیت)]

—**تہا**

(موسیقی) کھرج گرام کے تیسرے مورچھنے کا نام جس کی شکل یہ ہے:

دھا نی سا رے گاما پا پا ما گا رے سا نی دھا

دھیوت سے پنچم تک اور پنچم سے واپس دھیوت تک۔

[ا: اترا + پ: تہا (س: تسر = تین)]

—**چکارا**

(کنایہ) ناکارہ، مضمحل۔

ہاتھ پاؤں، اعضا اور جوارح اترے چکارے ہو رہے تھے۔

۱۹۰۵ کایا پلٹ، ۱۲۸

[ا: اترا + چکارا (رک) مرکب توصیفی]

—**سر** امذ

۱۔ کومل سر، چڑھے سر کی ضد، جس کی آواز چڑھے سر کے مقابلے میں مدھم معلوم ہوتی ہے۔ م: بھیرویں میں اترے سر ہیں۔

۲۔ وہ سر جو گانے میں قاعدے کے خلاف پڑے، دشمن سر، وادی سر

—**شحنہ مردک نام** کہاوت

منصب کے ساتھ اس کا رعب داب بھی جاتا رہتا ہے، کسی اعلیٰ مرتبے یا عہدے سے علحیدہ ہونے پر آدمی حقیر رہ جاتا ہے۔